فہرست

مطالعہ قرآن حکیم

تعارفِ قرآن

از: ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿حٰمٓ ۚ ﴿۱﴾ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۚ ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ ﴿۳﴾ وَاِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾

(الزخرف)

﴿فَلَاۤ اُقۡسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوۡمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّہٗ لَقَسَمٌ لَّوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عَظِیۡمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّہٗ لَقُرۡاٰنٌ کَرِیۡمٌ ﴿۷۷﴾ فِیۡ کِتٰبٍ مَّکۡنُوۡنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ ﴿۷۹﴾ تَنۡزِیۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۸۰﴾﴾ (الواقعۃ)

﴿بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۲۱﴾ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾﴾ (البروج)

ادعیہ ماثورہ کے بعد:

قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ

تعارفِ قرآن مجید کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا ایمان' یا اصطلاحِ عام میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟ قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱) قرآن اللہ کا کلام ہے۔

۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے' اور کُل کا کُل مِن وعَن موجود ہے' اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے' قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔ لیکن انہی تین جملوں کے

بارے میں اگر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے اور دقت نظر سے ان پر غور کیا جائے تو کچھ علمی حقائق سامنے آتے ہیں۔ تمہیدی گفتگو میں ان میں سے بعض کی طرف اجمالاً اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام

سب سے پہلی بات کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے' خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط﴾

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے اس کے مأمن تک پہنچا دو۔''

جب سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں مشرکین عرب کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو اَشہرِ حُرم کے خاتمے کے بعد تمہارا قتل عام شروع ہو جائے گا' تو اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو ایک ہدایت یہ بھی دی گئی کہ یہ الٹی میٹم دیئے جانے کے بعد اگر مشرکین میں سے کوئی آپ کی پناہ طلب کرے تو وہ آپ کے پاس آ کر مقیم ہو اور کلام اللہ کو سنے' جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔ یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ وہیں اس سے مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ کرو کہ آیا تم ایمان لاتے ہو یا نہیں۔ اس وقت میں نے اس آیت کا حوالہ صرف ''کلام اللہ'' کے الفاظ کے لئے شہادت کے طور پر دیا ہے۔

کلامِ الٰہی: جملہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر:

قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں ہی اس کی اصل عظمت کا راز مضمر ہے۔ اس لئے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے اور اس میں متکلم کی پوری شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کسی بھی شخص کا کلام سن کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے علم اور فہم و شعور کی سطح کیا ہے۔ آیا وہ تعلیم یافتہ انسان ہے' مہذب ہے' متمدن ہے یا کوئی اجڈ یا گنوار ہے۔ اس اعتبار سے درحقیقت یہ کلام اللہ' اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا مظہر ہے' اس میں اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا۔ ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

(جو بات میرے دل میں چھپی ہوئی ہے وہ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ قرآن کتاب نہیں ہے' کوئی اور ہی شے ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ یہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے' نیز یہ کلام بھی کرتا ہے۔)

مختلف مفاہیم و معانی کے لئے اس شعر کا حوالہ دے دیا جاتا ہے' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں اس کے ''چیزے دیگر'' ہونے کا کون سا پہلو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس میں درحقیقت سورۃ الحدید کے اس مقام کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ج﴾ (آیت ۳)

یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ **الاوّل** بھی ہے اور **الاٰخر** بھی‘ وہ **الظاھر** بھی ہے اور **الباطن** بھی۔ اسی طرح علامہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت الحیّ القیّوم ہے اسی طرح یہ کلام بھی زندہ و پائندہ ہے‘ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ پھر یہ صرف کلام نہیں‘ خود متکلم ہے۔

یہاں کلام اور متکلم کے مابین فرق کے حوالے سے متکلمین کی اس بحث کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ حق کی صفات‘ ذات سے علیحدہ اور مستزاد کوئی شے ہیں یا عین ذات؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں اس بحث کا ذکر کیا ہے ؂

ہیں صفاتِ ذاتِ حق‘ حق سے جدا یا عین ذات؟
اُمت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

یہ علم کلام کا ایک نہایت ہی پیچیدہ‘ غامض اور عمیق مسئلہ ہے‘ جس پر بڑی بحثیں ہوئیں اور بالآخر متکلمین کا اس پر تقریباً اجماع ہوا کہ ''لَا عَیْنٌ وَلَا غَیْرٌ''‘ یعنی اللہ کی صفات کو نہ اس کا عین قرار دیا جا سکتا ہے نہ اس کا غیر۔ اگر اس حوالے سے غور کریں تو قرآن حکیم بھی‘ جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے‘ اسی کے ذیل میں آئے گا‘ یعنی نہ اسے اللہ کا غیر کہا جا سکتا ہے نہ اس کا عین۔ چنانچہ اس حوالے سے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ قرآن مجید کی فی نفسہ عظمت کے ضمن میں اہم ترین ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱﴾

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا‘ اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔''

اس تمثیل کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طلبی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر حاضر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ وہی طلبی تھی جس میں آپ علیہ السلام کو تورات عطا کی گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطبہ و مکالمہ سے سرفراز فرمایا تو ان کی آتش شوق کچھ اور بھڑکی اور انہوں نے فرمائش کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ﴾ ''اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار عطا فرما''۔ مخاطبہ و مکالمہ کے شرف سے تو نے مجھے مشرف فرمایا ہے‘ اب ذرا مزید کرم فرما۔ اس پر جواب ملا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ ''(موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے!'' ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ﴾ ''لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو‘ مَیں اس پر اپنی ایک تجلی ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ﴾ ''چنانچہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو پھر تم مجھے دیکھ لو گے''۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ﴾ ''پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو وہ ''دَكًّا دَكًّا'' ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ''دَكًّا'' کے دونوں ترجمے کئے جا سکتے ہیں‘ یعنی ریزہ ریزہ ہو جانا‘ ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا‘ اور ایک یہ کہ کوٹ کوٹ کر کسی شے کو ہموار کر دینا‘ برابر کر دینا۔ جیسے سورۃ الفجر کی آیت ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝۲۱﴾ میں ان معنوں میں وارد ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں پہاڑ کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا یا دب گیا‘ زمین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ تجلی دیکھی جو بالواسطہ تھی‘ یعنی براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں بلکہ پہاڑ پر تھی اور حضرت موسیٰؑ بالواسطہ اس کا نظارہ کر رہے تھے‘ لیکن خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہوئی کہ ﴿خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ ''حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی بحث کا ایک عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ دب گیا یا پھٹ گیا، ریزہ ریزہ ہو گیا' اسی طرح قرآن مجید کے متعلق فرمایا:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط﴾

یعنی کلام اللہ کی بھی وہی کیفیت اور تاثیر ہے جو کیفیت وتاثیر تجلیٔ ذاتِ الٰہی کی ہے۔اس لئے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی صفت ہے۔تو تجلیٔ صفات اور تجلیٔ ذات میں کوئی فرق نہیں۔

البتہ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس بارے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔علامہ نے حضور ﷺ کی مدح فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کئے کہ ۔

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری وتبسمی!

علامہ حضرت محمد ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقابل کر رہے ہیں کہ وہ تو تجلیٔ صفات ہی سے بے ہوش ہو کر گر گئے' لیکن اے نبیؐ! آپ نے عینِ ذات کا دیدار کیا اور تبسم کی کیفیت میں کیا۔اس میں دو اعتبارات سے مغالطہ پایا جاتا ہے۔اوّل تو وہ تجلی' تجلیٔ صفات نہیں تجلیٔ ذات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر ڈالی۔جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کے لئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود متجلی ہوا۔دوسرے یہ کہ یہ خیال بھی مختلف فیہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے شب معراج میں ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔اگرچہ ہمارے اسلاف میں یہ رائے بھی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے' لیکن اکثر وبیشتر کی رائے اس کے برعکس ہے' اس لئے کہ وہاں بھی ''آیات'' کا ذکر ہے۔جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا:﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آیات' جو وہاں حضور نبی اکرم ﷺ نے دیکھیں' اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾﴾

''اُس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔اور اُس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں''۔

اب اُس سے زیادہ بڑی آیات اور اس سے زیادہ بڑی تجلیٔ الٰہی اور کہاں ہو گی؟ لیکن دونوں اعتبار سے اس شعر میں مبالغہ ہے۔البتہ اس آیۂ مبارکہ اور اس کے حوالے سے علامہ کے اس شعر ۔

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

میں میرے نزدیک قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔اور اس آیت مبارکہ کے حوالے سے وہ بات کہی جا سکتی ہے جو علامہ اقبال نے اس شعر میں کہی ہے۔

تورات کی گواہی:

اب ذرا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے حوالے سے ایک اور بات ذہن نشین کر لیجئے۔تورات میں کتابِ استثناء یا سفر استثناء جو صحف موسیٰ میں سے ایک صحیفہ ہے' کے اٹھارہویں باب میں نبی اکرم ﷺ کے لئے جو پیشین گوئی بیان کی گئی ہے اس میں الفاظ یہی ہیں کہ:

''میں ان کے بھائیوں میں سے ان کے لئے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ اُن سے وہی کچھ کہے گا جو مَیں اس سے کہوں گا''۔

مَیں نے یہاں خاص طور پر ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ ''مَیں اُس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔'' یہاں ایک تو لفظ کلام آیا ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی اس آیت میں آیا: ﴿حَتّٰی یَسۡمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ﴾ پھر ''کلام مُنہ میں ڈالنا'' کے حوالے سے قرآن مجید میں ایک لفظ دو مرتبہ آیا ہے' وہ لفظ ''قول'' ہے' یعنی قرآن کو قول قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الحاقہ میں ہے:

﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوۡلِ کَاہِنٍ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۴۲﴾﴾

اور سورۃ التکویر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ کَرِیۡمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیۡ قُوَّۃٍ عِنۡدَ ذِی الۡعَرۡشِ مَکِیۡنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیۡنٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُکُمۡ بِمَجۡنُوۡنٍ ﴿۲۲﴾﴾

اور اسی میں آگے چل کر آیا:

﴿وَمَا ہُوَ بِقَوۡلِ شَیۡطٰنٍ رَّجِیۡمٍ ﴿۲۵﴾﴾

قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان دو مقامات میں سے مؤخر الذکر کے متعلق تقریباً اجماع ہے کہ یہاں حضرت جبرئیلؑ مراد ہیں۔ گویا قرآن کو اُن کا قول قرار دیا گیا۔ اور سورۃ الحاقہ میں اسے نبی اکرم ﷺ کا قول قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں جن چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے کہ ''یہ کسی شاعر کا قول نہیں'' اور ''یہ کسی کاہن کا قول نہیں'' ان سے یقیناً رسول کریم ﷺ مراد ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اللہ کا کلام پہلے حضرت جبرئیل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اگر مَیں کتاب استثناء کے الفاظ استعمال کروں تو یہاں ''اللہ نے اپنا کلام ان کے مُنہ میں ڈالا''۔ تاہم ''اُن کے مُنہ'' کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے' وہ نہایت جلیل القدر فرشتے ہیں۔ بہرحال قول کا لفظ قرآن مجید کے لئے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتداءً کلامِ الٰہی حضرت جبرئیلؑ کے قول کی شکل میں اترا اور پھر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعے سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے مُنہ میں ڈالا گیا' اور وہاں سے یہ قولِ محمد ﷺ کی صورت میں لوگوں کے سامنے آیا' اس لئے کہ آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا' لوگوں نے صرف آپ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا۔ گویا یہ قول' قولِ شاعر نہیں' یہ قولِ کاہن نہیں' یہ قولِ شیطان الرجیم نہیں' بلکہ یہ قولِ رسولِ کریم ہے اور رسولِ کریم اوّلاً محمد رسول اللہ ﷺ ہیں' یہ لوگوں کے سامنے ان کے قول کی حیثیت سے آیا۔ پھر ثانیاً یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا قول ہے' اس لئے کہ انہوں نے یہ قول حضورؐ کو پہنچایا۔ اور اس کو آخری درجے تک پہنچانے پر یہ اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق تورات میں الفاظ آئے کہ ''مَیں اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔''

لوحِ محفوظ اور مصحف میں مطابقت:

کلام ہونے کے حوالے سے تیسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ کلام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مادیت اور جسمانیت سے ماوراء ہے۔ چنانچہ کلام اللہ حرف و صوت و رسم سے اعلیٰ' منزّہ' ارفع' مبرا اور ماوراء بلکہ وراءُ الوراء ہے۔ لیکن انسانوں کی ہدایت کے لئے اس نے حروف و اصوات کا جامہ پہنا۔ اور پھر یہ اللہ ہی کے پاس لوحِ محفوظ میں درج ہے جسے اُمّ الکتاب یا کتابِ مکنون بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے پاس موجود قرآن مجید یا مصحف اس کی نقل بمطابق اصل ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کسی دستاویز کی مصدقہ نقل ہے۔ چنانچہ سورۃ البروج میں فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾﴾

''یہ قرآن نہایت بزرگ و برتر ہے اور یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔''

اسی کے متعلق سورۃ الواقعہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾﴾

''یہ تو ایک کتاب ہے بڑی کریم' بہت باعزت' اور ایک ایسی کتاب ہے جو چھپی ہوئی ہے۔ جسے چھو ہی نہیں سکتے مگر وہی جو بہت ہی پاک کر دیئے گئے ہیں''۔

یعنی ملائکہ مقربین' جن کے بارے میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾﴾ (عبس)

''یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ کتاب مکنون ان فرشتوں کے پاس ہے' وہ تو تمہاری رسائی سے بعید و ماوراء ہے۔ میں پھر وہی الفاظ استعمال کر رہا ہوں' یہ درحقیقت نقل بمطابق اصل ہے جو تمہیں عطا کی گئی ہے۔

یہی بات سورۃ الزخرف میں کہی گئی ہے:

﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٤﴾﴾

''یہ تو درحقیقت اصل کتاب میں ہمارے پاس محفوظ ہے' بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب''۔

اُمٌّ کا لفظ جڑ اور بنیاد کے لئے آتا ہے۔ اسی لئے ماں کے لئے بھی عربی میں لفظ ''اُمّ'' استعمال ہوتا ہے' کیونکہ اسی کے بطن سے اولاد کی ولادت ہوتی ہے' وہ گویا کہ بمنزلۂ اساس ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اصل اساس اس لوحِ محفوظ میں ہے' کتابِ مکنون میں ہے۔ مزید وضاحت کر دی گئی کہ ''**لَدَيْنَا**''، یعنی وہ اُمّ الکتاب جو ہمارے پاس ہے' اس میں یہ قرآن درج ہے۔ ''**لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ**'' اس قرآن کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت بلند و بالا اور حکمت والا ہے' مستحکم ہے۔ وہ اللہ کا کلام اور نہایت محفوظ کتاب ہے۔ اسے لوحِ محفوظ کہیں' کتابِ مکنون کہیں' یا اُمّ الکتاب کہیں' اصل قرآن بہرحال وہاں ہے۔ وہ کلامِ الٰہی جو اصوات و حروف سے مبرأ' منزہ اور ماوراء تھا' پھر اُس نے اصوات و حروف کا جامہ پہنا' اسی عالم غیب میں' اُسی عالم اَمر میں اصل شکل میں ہے۔ البتہ اس کی تنزیل محمد رسول اللہ ﷺ پر ہوئی ہے اور اس تنزیل کی مصدقہ نقل ہمارے پاس مصاحف کی شکل میں محفوظ ہے۔

کلامِ الٰہی کی تین صورتیں:

جب میں نے عرض کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے کس طرح ہم کلام ہوتا ہے! قرآن مجید میں اس کی تین شکلیں بیان ہوئی ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٥١﴾﴾

(الشوریٰ)

''کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے روبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ برتر اور صاحب حکمت ہے۔''

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہے' اللہ تو ہر شے پر قادر ہے' وہ جو چاہے کرسکتا ہے' اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے' بلکہ کہا کہ انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہ راست کلام کرے' کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے' سوائے تین صورتوں کے' یا تو وحی یعنی مخفی اشارے کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی رسول (رسولِ مَلَک) کو بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتا ہے۔

اب کلامِ الٰہی کی مذکورہ تین شکلیں ہمارے سامنے آ ئی ہیں۔ان میں سے دو کے لئے لفظ وحی آیا ہے۔درمیان میں ایک شکل ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' بیان ہوئی ہے۔اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔اور یہ تو امر واقعہ ہے ہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اس صورت میں کلام فرمایا۔

پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو وہاں مخاطبہ ہوا۔یہ مخاطبہ اور مکالمۂ الٰہی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' ہوا تھا' اسی لئے تو وہ آتش شوق بھڑکی تھی کہ ؎

کیا قیامت ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں!

ظاہر ہے کہ جب ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے تو ایک قدم اور باقی ہے کہ مجھے دیدار بھی عطا ہو جائے' لیکن یہ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھا۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مخاطبہ شب معراج میں پردے کے پیچھے سے ہوا۔بعض حضرات کی رائے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ (یعنی ذاتِ الٰہی) کا دیدار حاصل ہوا' لیکن میری رائے سلف میں سے ان حضرات کے ساتھ ہے جو اس کے قائل نہیں ہیں۔ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی اہمیت کی حامل ہیں' انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لازماً ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا ہوگا' چنانچہ ان کی بات کے متعلق تو ہم یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع ہے۔حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ''نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی ؟'' یعنی اللہ تو نور ہے' اسے کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ نور تو دوسری چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے' نور خود کیسے دیکھا جا سکتا ہے! بہرحال میری رائے ہے کہ یہ گفتگو بھی من وراء حجاب تھی۔وہ وراء حجاب گفتگو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر مکالمہ ومخاطبہ میں نصیب ہوئی' اسی وراء حجاب ملاقات سے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں ''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی'' مشرف فرمایا۔

البتہ وحی براہِ راست بھی ہے' یعنی بغیر فرشتہ کے واسطہ کے۔تیسری قسم کی وحی فرشتے کے ذریعے سے ہے اور قرآن مجید سے جس بات کی طرف زیادہ راہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحی ہے بواسطہ ''مَلَک''۔جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ......﴾ (الشعراء) ''اسے لے کر آپ کے دل پر روحِ امین اترا ہے......'' اور: ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (البقرة:۹۷) ''پس اسے جبریل نے ہی آپ کے قلب پر نازل کیا ہے۔'' البتہ فرشتے کے بغیر وحی' یعنی دل میں کسی بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ڈال دیا جانا' یعنی ''الہام'' کا ذکر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس کے لئے حدیث میں ''نَفَثَ فِي الرَّوْعِ'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔یعنی کسی نے دل میں کوئی بات ڈال دی' کسی نے پھونک ماردی بغیر اس کے کہ کوئی آواز سننے میں آئی ہو۔ایک کیفیت صلصلۃ الجرس کی بھی تھی۔حضور کو گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر وحی نازل ہو جاتی تھی۔

بہرحال تیقّن کے ساتھ تو مَیں نہیں کہہ سکتا' لیکن میرا گمان غالب ہے کہ تیسری قسم کی وحی (بذریعۂ فرشتہ) پر پورے کا پورا قرآن مشتمل ہے۔اور وحی براہِ راست یعنی ''القاء'' تو درحقیقت وحی خفی ہے' جس کی وضاحت انگریزی کے دو الفاظ کے درمیان فرق سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ایک لفظ ہے

inspiration اور دوسرا revelation‘ جس کے ساتھ ایک اور لفظ verbal revelation بھی اہم ہے۔ inspiration میں ایک مفہوم‘ ایک خیال یا تصور انسان کے ذہن وقلب میں آ جاتا ہے‘ جب کہ revelation باقاعدہ کسی چیز کے کسی پر reveal کئے جانے کو کہتے ہیں۔ اور اس میں بھی عیسائیوں کے ہاں ایک بڑی بحث چل رہی ہے۔ وہ revelation کو مانتے ہیں لیکن verbal revelation کو نہیں مانتے‘ بلکہ ان کے نزدیک صرف مفہوم ہی انبیاء کے قلوب پر نازل کیا جاتا تھا‘ جسے وہ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس بارے میں مستقل اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہ لفظاً بھی وحی ہے اور معناً بھی‘ لفظاً بھی اللہ کا کلام ہے اور معناً بھی‘ یعنی یہ verbal revelation ہے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ لاہور ہی میں غالباً ایف سی کالج کے پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا تھا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ ان صاحب نے علامہ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ verbal revelation کے قائل ہیں! اس پر علامہ نے اس وقت جو جواب دیا وہ اُن کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں‘ میں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں‘ بلکہ مجھے تو اس کا تجربہ ہے۔ چنانچہ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ کے جامے میں ڈھلے ہوئے آتے ہیں‘ میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا‘ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ مجھ پر نازل کئے جاتے ہیں۔ تو یہ درحقیقت کسی کو جواب دینے کا وہ انداز ہے جس کو عربی میں ”الاجـــــوبة المُسكتة“ یعنی چپ کرا دینے والا جواب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جواب ہے جس کے بعد فریق ثانی کے لئے کسی قیل وقال کا موقع ہی نہیں رہتا۔

بہرحال کلامِ الٰہی واقعتاً verbal revelation ہے جس نے اوّلاً قولِ جبرائیل کی شکل اختیار کی۔ حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے قول کی شکل میں نازل ہوا۔ اور پھر زبانِ محمدی سے قولِ محمدی کی شکل میں ادا ہوا۔ تو یہ درحقیقت revelation ہے‘ inspiration نہیں‘ اور محض revelation بھی نہیں بلکہ verbal revelation ہے‘ یعنی معانی‘ مفہوم اور الفاظ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی اللہ کا کلام ہے۔

(۲) قرآن کا رسول اللہ ﷺ پر نزول

قرآن مجید کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ضمن میں بھی چند باتیں نوٹ کر لیں۔ پہلی بحث تو ”نزول“ کی لغوی بحث سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نَزَلَ‘ یَنْزِلُ ثلاثی مجرد میں بھی آتا ہے۔ تب یہ فعل لازم ہوتا ہے‘ یعنی ”خود اترنا“۔ قرآن مجید کے لئے ان معنوں میں یہ لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ط﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۵) ”ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے“۔ یہاں یہ فعل لازم آ رہا ہے‘ یعنی نازل ہوا۔ عام طور پر فعل لازم کو متعدی بنانے کے لئے اس فعل کے ساتھ کسی صلہ (preposition) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فعل نَزَلَ ”بِ“ کے ساتھ متعدی ہو کر بھی قرآن مجید میں آیا ہے۔ بمعنی اُس نے اتارا‘ جیسے جَاءَ ”وہ آیا“ سے جَاءَ بِهٖ ”وہ لایا“۔ مثلاً: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ......﴾ (الشعراء) یعنی رُوح الامین (جبرائیل) نے اس قرآن کو اتارا ہے محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیتیں: اِنزال اور تنزیل

ثلاثی مزید فیہ کے دو ابواب یعنی بابِ افعال اور باب تفعیل سے یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں ابواب سے یہ فعل متعدی کے طور پر بمعنیٰ ”اتارنا“ استعمال ہوتا ہے‘ یعنی اَنْزَلَ‘ یُنْزِلُ‘ اِنْزَالاً اور نَزَّلَ‘ یُنَزِّلُ‘ تَنْزِیْلًا۔ ان دونوں کے مابین فرق یہ ہے کہ بابِ افعال میں کوئی

فعل دفعۃً اور یک دم کر دینے کے معنی ہوتے ہیں جبکہ باب تفعیل میں وہی فعل تدریجاً 'اہتمام' توجہ اور محنت کے ساتھ کرنے کے معنی ہوتے ہیں۔ان دونوں کے مابین فرق کو ''اعلام'' اور ''تعلیم'' کے معنی کے فرق کے حوالے سے بہت ہی نمایاں طور پر اور جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔''اعلام'' کے معنی ہیں بتا دینا۔یعنی آپ نے کوئی چیز پوچھی تو جواب دے دیا گیا۔چنانچہ ''Inquiry Office'' یا ''Information Office'' کو عربی میں ''مکتب الاعلام'' کہا جاتا ہے۔جبکہ ''تعلیم'' کے معنی ذہن نشین کرانا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا ہے۔یعنی پہلے ایک بات سمجھا دینا' پھر دوسری بات اس کے بعد بتانا اور اس طرح درجہ بدرجہ مخاطب کے فہم کی سطح بلند سے بلند تر کرنا۔

اگرچہ قرآن مجید کے لئے لفظ ''اِنْـزَال'' اور اس سے مشتق مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن بکثرت لفظ ''تنزیل'' استعمال ہوا ہے۔قرآن مجید کی اصل شان تنزیلی شان ہے' یعنی یہ کہ اس کو تدریجاً' رفتہ رفتہ' تھوڑا تھوڑا اور نجماً نجماً نازل کیا گیا۔چنانچہ قرآن مجید کے حضور ﷺ پر نزول کے لئے صحیح تر اور زیادہ مستعمل لفظ قرآن حکیم میں تنزیل ہے' تاہم دو مقامات پر لَیْـلَةُ الْقَدْرِ اور لَیْـلَةٌ مُّبٰـرَكَةٌ کے ساتھ انزال کا لفظ آیا ہے۔فرمایا: ﴿اِنَّـآ اَنْـزَلْنٰـــهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ (القدر) اور: ﴿اِنَّـآ اَنْـزَلْنٰـــهُ فِیْ لَیْـلَةٍ مُّبٰـرَكَةٍ﴾ (الدخان:۳) اسی طرح ﴿شَهْـرُ رَمَـضَـانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْـهِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) میں بھی لفظ ''انزال'' استعمال ہوا ہے۔پھر حضور ﷺ پر نزول کے لئے بھی کہیں کہیں لفظ ''انزال'' آیا ہے' اگرچہ اکثر و بیشتر لفظ ''تنزیل'' ہی آیا ہے۔اس کی تقریباً مجمع علیہ تاویل یہ ہے کہ پورا قرآن دفعۃً لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا تک لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا' جسے ''لیلۃ مبارکہ'' بھی کہا گیا ہے جو کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔لہٰذا جب رمضان مبارک کی لیلۃ القدر یا لیلۂ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا ذکر ہوا تو لفظ انزال استعمال ہوا۔قرآن مجید سمائے دنیا پر ایک ہی بار مکمل پور طور پر نازل ہونے کے بعد وہاں سے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کر کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔لہٰذا حضور ﷺ پر نزول کے لئے اکثر و بیشتر لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے۔

لفظ تنزیل کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ نہایت اہم ہے۔ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ط﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

تورات تختیوں پر لکھی ہوئی' مکتوب شکل میں حضرت موسیٰ ؑ کو دی گئی تھی۔وہ چونکہ دفعۃً اور جملۃً واحدۃً دے دی گئی' اس لئے اِس کے لئے لفظ انزال آیا ہے۔چنانچہ متذکرہ بالا آیت میں ''تنزیل'' اور ''انزال'' ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آئے ہیں۔گویا یہاں ''تُـعْـرَفُ الْاَشْیَـاءُ بِاَضْدَادِهَا'' (چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول درست بیٹھتا ہے۔

حکمتِ تنزیل:

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنزیل کی حکمت کیا ہے؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا اور ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ قرآن مجید میں اس کی دو حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگ شاید اس کا تحمل نہ کر سکتے۔چنانچہ لوگوں کے تحمل کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تاکہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھیں' اس پر غور کریں اور اسے حرزِ جان بنائیں اور اسی کے مطابق ان کے ذہن و فکر کی سطح بلند ہو۔یہ حکمت سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۰۶)﴾

''اور ہم نے قرآن کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تاکہ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے لوگوں کو سناتے رہیں اور ہم نے اسے بتدریج اتارا۔''

اس حکمت کو سمجھنے کے لئے بارش کی مثال ملاحظہ کیجئے۔ بارش اگر ایک دم بہت موسلا دھار ہو تو اس میں وہ برکات نہیں ہوتیں جو تھوڑی تھوڑی اور تدریجاً ہونے والی بارش میں ہوتی ہیں۔ بارش اگر تدریجاً ہو تو زمین کے اندر جذب ہوتی چلی جائے گی' لیکن اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ بہتا چلا جائے گا۔ یہی معاملہ قرآن مجید کے انزال و تنزیل کا ہے۔ یہ لوگوں کی مصلحت ہے کہ قرآن ان کے فہم میں' ان کے باطن میں' ان کی شخصیتوں میں تدریجاً سرایت کرتا چلا جائے۔ سرایت کے حوالے سے مجھے پھر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ہے۔ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جان چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

''(یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لئے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!''

تو جب یہ قرآن کسی کے اندر اس طرح اتر جاتا ہے جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے سرایت کرنے کے لئے اس کا تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا ہی حکمت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات سورۃ الفرقان میں کہی گئی ہے' اس لئے کہ وہاں کفارِ مکہ بالخصوص سردارانِ قریش کا باقاعدہ ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (۳۲) وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا (۳۳)﴾

''منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ —— ہاں' ایسا اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کو ہم اچھی طرح آپ کے ذہن نشین کرتے رہیں اور اس کو ہم نے بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے' اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے آپ کو دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔''

اعتراض یہ تھا کہ یہ پورا قرآن یک دم' یک بارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ اس اعتراض میں جو وزن تھا' پہلے اس کو سمجھ لیجئے۔ انہوں نے جو بات کی درحقیقت اس سے مراد یہ تھی کہ جیسے ہمارا ایک شاعر دفعۃً پورا دیوان لوگوں کو فراہم نہیں کر دیتا' بلکہ وہ ایک غزل کہتا ہے' قصیدہ کہتا ہے' پھر مزید محنت کرتا ہے' پھر کچھ اور طبع آزمائی کرتا ہے' پھر کچھ اور کہتا ہے' اس طرح تدریجاً دیوان بن جاتا ہے' اسی طریقے سے محمد (ﷺ) کر رہے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو پورے کا پورا یک دم نازل ہو سکتا تھا۔ یہ تو درحقیقت انسان کی کیفیت ہے کہ پوری کتاب دفعۃً produce نہیں کر دیتا۔ پورا دیوان تو کسی شاعر نے ایک دن کے اندر نہیں کہا بلکہ اسے وقت لگتا ہے' وہ مسلسل محنت کرتا ہے' کچھ تکلف بھی کرتا ہے' کبھی آمد بھی ہو جاتی ہے' لیکن وہ کلام دیوان کی شکل میں تدریجاً مدوّن ہوتا ہے۔ تو یہ تو اسی طرح کی چیز ہے۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ ''کیوں نہیں یہ قرآن اس پر یک دم نازل ہو گیا؟''

اب اس کا جواب دیا گیا: ﴿كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ ''یہ اس لئے کیا ہے تاکہ اے نبیؐ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو تثبیت (جماؤ) عطا کریں۔'' یعنی وہ بات جو عام انسانوں کی مصلحت میں ہے وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی مصلحت پر مبنی ہے کہ آپ کے لئے بھی شاید قرآن مجید

کا یک بار گی تحمل کرنا مشکل ہو جاتا۔سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط﴾ ''اگر ہم پورے کے پورے قرآن کو دفعۃً کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا''۔(نوٹ کیجئے کہ یہاں لفظ''انزال''آیا ہے)۔معلوم ہوا کہ قلب محمدیؐ کو جماؤ اور ٹھہراؤ عطا کرنے کے لئے اسے بتدریج نازل کیا گیا ہے۔﴿وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ ''اور ہم نے اس کو بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے''۔''رتل''چھوٹے پیانے کو'چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔

اگلی آیت میں جو ارشاد ہوا اس کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ایک یہ کہ اے نبی! جو اعتراض بھی یہ ہم پر کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلسل کشاکش ہے جو آپ کے اور مشرکین عرب کے درمیان چل رہی ہے۔آج وہ ایک بات کہتے ہیں'اگر اسی وقت اس کا جواب دیا جائے تو وہ درحقیقت آپ کی دعوت کے لئے موزوں ہے۔اگر یہ سارے کا سارا کلامِ الٰہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو حالات کے ساتھ اس کی مطابقت اور ان کی طرف سے پیش ہونے والے اعتراضات کا بروقت جواب نہ ہوتا اور اس کے اندر جو اثر انداز ہونے کی کیفیت ہے وہ پھر حاصل نہ ہوتی۔اس تدریج میں اپنی جگہ موزونیت ہے اور اس کی اپنی تاثیر ہے۔اس اعتبار سے قرآن مجید کو تدریجاً نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نزول کے ضمن میں اب دو چھوٹی چھوٹی چیزیں اور نوٹ کر لیجئے۔یہ صرف معلومات کے ضمن میں ہیں۔اس کا زمانہ نزول کیا ہے؟ ہم جس حساب (سن عیسوی) سے بات کرنے کے عادی ہیں'اسی حساب سے ہمارے ذہن کا صغریٰ کبریٰ بنا ہوا ہے۔اس اعتبار سے نوٹ کر لیجئے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس پر مشتمل ہے۔یہ ۲۳ برس قمری بنیں گے۔۴۰ عام الفیل سے شروع کریں تو ۱۲ سال قبل ہجرت اور ۱۱ ہجری سال مل کر ۲۳ سال قمری بنیں گے'جن کے دوران یہ قرآن بطرزِ تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ایک رائے ذرا کمزور سی ہے کہ قرآن کریم کے نزول کا زمانہ ۲۳ برس نہیں بلکہ ۲۰ برس ہے۔بعض روایات کے مطابق ابتداء میں حضور ﷺ کے ساتھ تین برس تک حضرت اسرافیل رہے ہیں اور انہوں نے کوئی تعلیم حضور ﷺ کو دی جسے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ وہ کیا تعلیم تھی۔بہرحال یہ قول اس اعتبار سے ضعیف قرار پاتا ہے کہ صحیح احادیث میں یہ شہادت موجود ہے کہ پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیات نازل ہوئیں'پھر تین سال کا وقفہ آیا۔سورۃ العلق کی یہ پانچ آیات بھی چونکہ قرآن مجید کا حصہ ہیں'لہٰذا صحیح قول یہی ہے کہ قرآن حکیم کا زمانہ نزول ۲۳ قمری یا ۲۲ شمسی سال ہے۔

اب یہ کہ نزول کی جگہ کون سی ہے؟ اس ضمن میں صرف ایک لفظ نوٹ کر لیجئے کہ تقریباً پورے کا پورا قرآن''حجاز''میں نازل ہوا۔اس لئے کہ آغازِ وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ کا کوئی سفر حجاز سے باہر ثابت نہیں ہے۔آغازِ وحی سے قبل آپ نے متعدد سفر کئے ہیں۔آپؐ شام کا سفر کرتے تھے'یقیناً یمن بھی آپؐ جاتے ہوں گے۔اس لئے کہ الفاظِ قرآنی''رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ'' کی رو سے قریش کے سالانہ دو سفر ہوتے تھے۔گرمیوں کے موسم میں شمال کی طرف جاتے تھے'اس لئے کہ فلسطین کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا ہے اور سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کی طرف (یمن) جاتے تھے'اس لئے کہ وہ گرم علاقہ ہے۔تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تجارتی سفر کئے ہیں۔بعض محققین نے تو یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ آپؐ نے اُس زمانے میں کوئی بحری سفر بھی کیا اور گلف کو عبور کر کے مکران کے ساحل پر کسی جگہ آپؐ تشریف لائے (واللہ اعلم!)۔یہ بات میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر میں سنی تھی جو انہوں نے حیدرآباد (سندھ) میں دیا تھا'لیکن بعد میں اس پر جرح ہوئی کہ یہ بہت ہی کمزور قول ہے اور اس کے لئے کوئی سند موجود نہیں ہے۔البتہ ''الخُبر''جہاں آج آباد ہے وہاں پر تو ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا اور حضور ﷺ کا وہاں تک آنا ثابت ہے۔بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ آغازِ وحی کے بعد دس سال تک تو مکہ مکرمہ میں رہے'اس کے بعد طائف کا سفر کیا ہے۔پھر آس پاس''عکاظ''کا میلہ لگتا تھا اور منڈیاں لگتی

تھیں‘ ان میں آپ نے سفر کئے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی ہے۔ اس کے بعد سب جنگیں حجاز کے علاقے ہی میں ہوئیں‘ سوائے غزوۂ تبوک کے۔ لیکن تبوک بھی اصل میں حجاز ہی کا شمالی سرا ہے۔ اس اعتبار سے حجاز ہی کا علاقہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ تاہم دو آیتیں اس اعتبار سے مستثنیٰ قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں بلکہ آسمان پر نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو تین تحفے عطا کئے‘ ان میں نماز کی فرضیت اور دو آیاتِ قرآنی شامل ہیں۔ یہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات ہیں جو عرش کے دو خزانے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں عطا ہوئے۔ تو یہ دو آیتیں مستثنیٰ ہیں کہ یہ زمین پر نازل نہیں ہوئیں بلکہ آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ پر دی گئیں اور خود آپؐ ساتویں آسمان پر تھے‘ جبکہ پورا قرآن آسمان سے زمین پر نازل ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے حجاز کا علاقہ مہبطِ وحی ہے۔

(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے بارے میں تین بنیادی اور اعتقادی چیزیں ہیں: اوّل‘ یہ اللہ کا کلام ہے۔ دوم‘ یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ سوم‘ یہ مِن وعَن کُل کا کُل محفوظ ہے۔ اس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہوسکتی ہے نہ بیشی ہوسکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس میں کچھ اشتباہ اہل تشیع نے پیدا کیا ہے‘ لیکن ان کی بات بھی میں کچھ یقین کے ساتھ اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ''ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں''۔ البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں‘ فلاں سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح اور شان میں تھی‘ وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ‘ ان کے بارے میں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کالانعام کی باتیں ہیں یا ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن یہ کہ بہرحال اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور کُل کا کُل مِن وعَن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس کے لئے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہوکر سورۃ القیامۃ میں آئی ہے۔ فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازراہِ شفقت فرمایا کہ ''آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔ آپؐ مشقت نہ جھیلیں‘ یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینہ مبارک کے اندر جمع کردیں گے اور اس کی ترتیب قائم کردیں گے‘ اس کو پڑھوا دیں گے۔ جس ترتیب سے یہ نازل ہورہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجئے۔ اصل ترتیب جس میں اس کا مرتب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے‘ جو ترتیب لوحِ محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوا دیں گے۔ ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ پھر اگر آپ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تدوین بھی ہمارے ذمہ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے‘ اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔ صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾ ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ع

حرفِ اُو را ریب نے‘ تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

''اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّوبدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔''

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: ۱۔قرآن کے حروف میں یعنی اس کے متن میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ مِن وعَن محفوظ ہے۔۲۔اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو' کہیں تبدیلی کی گئی ہو' قطعاً ایسا نہیں۔۳۔کیا اس کی آیات کی الٹ سلٹ تاویل بھی کی جا سکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے' اس لئے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجۂ استناد کو نہیں پہنچ سکی' اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہو سکا' قرآن نے خود اس کو ردّ کر دیا۔جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے' ایسی تاویلات بھی اُمت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔سورۂ حم السجدۃ کی آیت ۴۲ میں ہے:﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ ﴿۴۲﴾﴾ ''باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہو سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے''۔

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے' اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے' اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے—— سورۃ الحاقۃ کی یہ آیات ملاحظہ کیجئے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ ﴿۴۷﴾﴾

''(کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا) اگر یہ (ہمارے نبی محمد ﷺ) خود بھی (بفرضِ محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑیں گے اور ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔پھر تم میں سے کوئی (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی ومددگار) نہیں ہوگا کہ جو انہیں ہماری پکڑ سے بچا سکے۔''

یہاں تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔کفار ومشرکین کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپ اس قرآن میں کچھ نرمی اور لچک دکھائیں' یہ تو بہت rigid ہے' بہت ہی uncompromising ہے' بہرحال دنیا میں معاملات ''کچھ لو کچھ دو'' (give and take) سے طے ہوتے ہیں' لہٰذا کچھ آپ نرم پڑیں کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔اس کے بارے میں فرمایا:﴿وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَیُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾﴾ (القلم) ''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے''۔اور سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵﴾﴾

''جب انہیں ہماری آیاتِ بیّنات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجئے۔(اے نبی! ان سے) کہہ دیجئے میرے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔''

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً' معناً' متناً کلی طور پر محفوظ ہے۔

قرآن مجید کی زبان

اب آیئے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اوراس زبان کی شان کیا ہے؟ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت تکرار واعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں ہے، یعنی شستہ، صاف، سلیس، کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف واصوات کا جامہ پہنا، وہ حروف واصوات لوحِ محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلام الٰہی، قولِ جبرائیل علیہ السلام اور قول محمد ﷺ بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣﴾

''حٰم۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآنِ عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو''۔

قرآن کی مخاطب اوّل قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اولاً حروف واصوات کا جامہ پہنا ہے، پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔

یہی بات سورۃ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝١ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢﴾

''ا، ل، ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم سمجھ سکو۔''

سورۃ الشعراء میں فرمایا:

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝١٩٥﴾

''صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔''

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝٢٨﴾

''ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے، جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، تاکہ وہ بچ کر چلیں۔''

اس میں کہیں کجی نہیں، کہیں کوئی ایچ پیچ نہیں، اس کی زبان بہت سلیس، شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجئے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لئے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں، تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر، لیبیا، الجزائر، موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے، لیکن جو اُن کے ہاں فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰ اور ۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لئے ناقابل فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آ سکتی، اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور

اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی بدل دیئے گئے ہیں۔ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے' وہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔اس لئے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جارہی ہے وہ بہت مختلف ہے' اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی ——— لیکن عربی ''فصیح زبان'' ایک ہے۔یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔حجاز میں بادیہ نشین تھے۔عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے' شہر والوں کی نہیں۔جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے تھے۔قافلے آ رہے ہیں' جا رہے ہیں' ٹھہر رہے ہیں۔جہاں اس طرح کی آمدورفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آ جاتے ہیں۔خاص اسی وجہ سے شرفاء اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے' خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔علامہ جلال الدین سیوطی نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو مُعرّب ہو گئے ہیں۔ابراہیم' اسمٰعیل' اسرائیل' اسحاق' یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔لفظ ''اِیل'' عبرانی زبان میں اللہ کے لئے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔اسی طریقے سے ''سِجِّیل'' کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھٹے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔یہ کنکر ''سجیل'' کہلاتے ہیں جو ''سنگِ گل'' کا معرب ہے۔باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا' وہ حجاز کے علاقے بادیہ نشینوں کی عربی ہے' جس میں فصاحت و بلاغت نقطۂ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔اس کا ایک ''ملکوتی غنا'' (Devine Music) ہے' اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے۔یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت' بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔واضح رہے کہ ادب میں ''تنقید'' دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا' اسے جانچنا' پرکھنا۔اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا' اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ایک علاقے کی عامی (colloquial) عربی دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔خود نزولِ قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے۔قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔لہٰذا اگر تحقیق و تدبر قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معین کر دیئے ہیں۔ایک عام قاری کو' جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے' صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے' اس کھکیڑ میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔البتہ تدبر قرآن کے لئے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی ایک

لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اتار لی جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعر جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبر قرآن کے لئے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اسماء و صفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء و صفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن حکیم کے اسماء و صفات قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے' مثلاً لفظ ''برہان'' ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی صفات' اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لئے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے' لیکن میں نے انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرفہ کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لئے وارد ہوئے ہیں' جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ''قرآن مجید'' میں ''مجید'' قرآن کا نام نہیں ہے' درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ''القرآن المجید'' میں اگرچہ ''الف لام'' کے ساتھ ''المجید'' آتا ہے' لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہٰذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لئے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لئے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے ''القرآن'' ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا)۔ اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ''الکتاب'' ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ''الذکر'' ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لئے سب سے زیادہ جامع نام ''الھدیٰ'' ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت کے اعتبار سے اہم ترین نام ''النور'' ہے۔ قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم شان جو ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ''الفرقان'' ہے۔ یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شے۔ قرآن کا ایک نام ''الوحی'' بھی آیا ہے: ﴿قُلۡ اِنَّمَاۤ اُنۡذِرُكُمۡ بِالۡوَحۡیِ﴾ (الانبیاء: ۴۵)۔ اسی طرح ''کلام اللہ'' کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے: ﴿حَتّٰی یَسۡمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ: ۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے' لہٰذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔ میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں' وہ تو یہی بنتے ہیں۔ اگرچہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' جو لفظ بھی قرآن کے لئے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لئے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں' لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) كَرِیۡمٌ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرۡاٰنٌ كَرِیۡمٌ ﴿۷۷﴾﴾ (الواقعۃ) (۲) اَلۡحَكِیۡمُ: ﴿یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَكِیۡمِ ﴿۲﴾﴾ (یٰسٓ) (۳) اَلۡعَظِیۡم: ﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ﴿۸۷﴾﴾ (الحجر) (۴) مَجِیۡدٌ اور اَلۡمَجِیۡدُ: ﴿بَلۡ هُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿۲۱﴾﴾ (البروج) اور ﴿قٓ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ﴿۱﴾﴾ (قٓ) (۵) اَلۡمُبِیۡنُ: ﴿حٰمٓ ﴿۱﴾ وَالۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ﴿۲﴾﴾ (الزخرف) (۶) رَحۡمَةٌ: ﴿هُدًی وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ (یونس) (۷) عَلِیٌّ: ﴿وَاِنَّهٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡكِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَكِیۡمٌ ﴿۴﴾﴾ (الزخرف) (۸) بَصَآئِرُ: ﴿قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ﴾ (الانعام: ۱۰۴) (۹'۱۰) بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا: (حٰمٓ السجدۃ: ۴) [اگرچہ یہ الفاظ انبیاء کے لئے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لئے بھی آئے ہیں۔ قرآن اپنی ذات میں فی نفسہٖ بشیر بھی ہے' نذیر بھی ہے] (۱۱) بُشۡرٰی: ﴿وَبُشۡرٰی لِلۡمُسۡلِمِیۡنَ﴾ (النحل: ۸۹'۱۰۲) (۱۲) عَزِیۡزٌ: ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیۡزٌ ﴿۴۱﴾﴾ (حٰم السجدۃ) (۱۳) بَلٰغٌ: ﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراھیم: ۵۲) (۱۴) بَیَانٌ: ﴿هٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران: ۱۳۸) (۱۵) مَوۡعِظَةٌ (۱۶) شِفَآءٌ: ﴿قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ﴾

(یونس:۵۷) (۱۷) اَحْسَنُ الْقَصَصِ:﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) (۱۸) اَحْسَنُ الْحَدِیْثِ (۱۹) مُتَشَابِہ (۲۰) مَثَانِیَ:﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ﴾ (الزمر:۲۳) (۲۱) مُبَارَكٌ:﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰـهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ﴾ (ص:۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَيْمِنٌ:﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۸)(۲۴) قَیِّم:﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِنْ لَّدُنْهُ﴾ (الکہف:۲) یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لئے آئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' جو اس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں' اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہو گی۔ آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں' اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں' نذیر بھی ہیں' ہادی بھی ہیں' معلم بھی ہیں۔ قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء وصفات ہیں۔

لفظ ''قرآن'' کی لغوی بحث:

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ''القرآن'' ہے' جس کے لئے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لئے استعمال نہیں ہوا' ورنہ تورات کتاب بھی ہے' ہدایت بھی تھی' اور اس کے لئے لفظ نور بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّـا اَنْـزَلْـنَـا التَّوْرٰىةَ فِيْهَـا هُـدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدۃ:۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی''۔ خود قرآن مجید ہدایت بھی ہے' نور بھی ہے' رحمت بھی ہے۔ تو بقیہ تمام اوصاف تو مشترک ہیں' لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کتبِ سماویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی' اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لئے ہے۔ اسی لئے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم علَم ہے' اور اسم جامد ہے' اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ''اللہ'' کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہے' اسم علم ہے' اسم جامد ہے' مشتق نہیں ہے' یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ''علیم'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ''العلیم'' نام ہے' رحیم صفت ہے اور ''الرحیم'' نام ہے' اسی طرح الٰہ پر ''ال'' داخل ہوا تو ''الالٰــہ'' بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ''اللہ'' بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہٖ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم جامد اور اسم علم ہے' اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے' جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ''قرن'' ہے' یعنی قرآن میں جو ''ن'' ہے وہ بھی حرفِ اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہل علم کی دلچسپی کے لئے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ''قرن'' مانا ہے' اُن کی بھی دو رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ''قَرَنَ الشَّیءَ بِالشَّیْءِ'' (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات' اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا' اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ''قرآن'' بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے' جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں' کہ یہ قرینہ اور قرائن سے بنا ہے۔ قرائن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں' جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ''كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ''۔ اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق ر ء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔ قَرَاَ' يَقْرَاُ' قَرْاً' وَقِرَاءَةً وَقُرآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔ جیسے رَجَحَ سے رُجحان اور غَفَرَ سے غُفران۔ ان کے مادہ میں ''ن'' شامل نہیں ہے۔ تو جیسے غفران اور رجحان مصدر ہیں' ایسے ہی قــراَ سے مصدر قرآن ہے' یعنی پڑھنا۔ اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے۔ تو قرآن کا مفہوم ہو گا پڑھی جانی والے

شے' پڑھی گئی شے۔ ''قَرَأَ'' میں جمع کرنے کا مفہوم بھی ہے۔ عرب کہتے ہیں: قرأتُ المَاءَ فِی الْحَوْضِ ''میں نے حوض کے اندر پانی جمع کرلیا''۔ اسی سے قریہ بنا ہے' یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔ تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔ جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں' مل جل کر رہ رہے ہوں۔ تو جمع کرنے کا مفہوم قَـرَءَ میں بھی ہے اور قرن میں بھی ہے۔ یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ بہرحال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آ رہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شد و مد کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے۔ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ط﴾ (یٰسٓ: ٦٩) ''ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں' نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے''۔ شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾﴾

''اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔''

اگلی آیت میں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے' اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule) —— چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں' کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ ؐ کبھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔ اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا' لہٰذا آپ کے اندر شاعری کا وصف ہی پیدا نہیں کیا گیا۔ سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: ''اَشْهَدُ اَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ''' ''میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ اس لئے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ط﴾۔ تو واقعتاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کے بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً)) یعنی بہت سے بیان' بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے' لیکن قرآن بہرحال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر' وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں' اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے' لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لئے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے' جسے آپ ''آزاد نظم'' (Blank Verse) کہتے ہیں' اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں اُن کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک ردھم بھی ہوتا ہے' اس میں فواصل بھی ہیں' قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے' لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا

ہوں' اگرچہ اس کے وہ معانی نہیں ع ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔ آپ کسی کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ ایک بابمیں ایک بات مکمل ہو جانی چاہئے۔ اگلے باب میں بات آگے چلے گی' کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔ تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ ایک کتاب ایک مضمون کے اعتبار سے وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں جو معروف معنی میں کتاب کا اطلاق کیا جاتا ہے' اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآناً تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جبکہ کتاب کا لفظ توراۃ' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لئے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصّوں اور احکام کے لئے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعۂ مقالات (Collection of Essays) بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکتفی اور ایک مکمل شے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں' خطابت یا شاعری۔ شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔ شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ''سبعة معلّقة'' کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دو سب سے زیادہ معروف اصناف (شاعری اور خطبہ) میں خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of Devine Orations) ہے' جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیئے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' اُن کے نظریات سے وہ خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویل خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدر مملکت کو' حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی' اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے' کبھی دوسری طرف کر رہا ہے' کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تحویل خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خطاب کا رُخ معین ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے'

مخاطب کون ہے' تو اس بات کا اصل مفہوم اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے' ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں' جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جھانک کر بات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔

﴿وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟'' ﴿اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (ابراھیم:۱۰) ''(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟'' یہ انداز بہر حال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہوگا' یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہوگا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا' اِدھر جائے گا' اُدھر جائے گا' لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کئے' جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاری بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے' پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی' کبھی مغرب کی' کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا' کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی۔ لیکن اوّل و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات' کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے' کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو' ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو' یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ' شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے تو آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہئے۔ اسی لئے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کئے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اصل مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات' اسی طرح سورۃ آل عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب' جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں' مجموعۂ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

آیات اور سورتوں کی تقسیم

بہت سی چیزوں سے مل کر کوئی شے مرکب بنتی ہے۔قرآن کلام مرکب ہے۔اس کی تقسیم سورتوں اور آیات میں ہے۔ پھر اس میں احزاب اور گروپ ہیں۔ عام تصورِ کتاب تو یہ ہے کہ اس کے ابواب ہوتے ہیں' لیکن قرآن حکیم پر ان اصطلاحات کا اطلاق نہیں ہوتا۔قرآن حکیم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کی ہیں۔ان اصطلاحات کی دنیا میں موجود کسی بھی کتاب کی اصطلاحات سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ جاحظ نے ایک بڑا خوبصورت عنوان قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب اس سے تو واقف تھے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء کے دیوان ہوتے تھے۔سارا کلام کتابی شکل میں جمع ہو گیا تو وہ دیوان کہلایا۔لہٰذا کسی بھی درجے میں اگر مثال اور تشبیہ سے سمجھنا چاہیں تو دیوان کے مقابلے میں لفظ قرآن ہے۔ پھر دیوان بہت سے قصائد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی کسی شاعر کا دیوان ہو گا تو اس میں قصائد ہوں گے' غزلیں ہوں گی' نظمیں ہوں گی۔قرآن حکیم میں اس سطح پر جو لفظ ہے وہ سورت ہے۔اللہ تعالیٰ کا یہ کلام سورتوں پر مشتمل ہے۔اگر کوئی نثر کی کتاب ہے تو وہ جملوں پر مشتمل ہو گی اور اگر نظم کی ہے تو وہ اشعار پر مشتمل ہو گی۔اس کی جگہ قرآن مجید کی اصطلاح آیت ہے۔شاعری میں اشعار کے خاتمے پر ردیف کے ساتھ ساتھ ایک لفظ قافیہ کہلاتا ہے اور غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں۔قرآن مجید پر بھی ہم عام طور پر اس لفظ کا اطلاق کر دیتے ہیں' اس لئے کہ قرآن مجید کی آیات میں بھی آخری الفاظ کے اندر صوتی آہنگ ہے۔ یہاں انہیں فواصل کہا جاتا ہے' قافیہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا کہ کسی بھی درجے میں شعر کے ساتھ کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید کا سب سے چھوٹا یونٹ آیت ہے۔یعنی قرآن مجید کی ابتدائی اکائی کے لئے لفظ آیت اخذ کیا گیا ہے۔آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ قرآنی آیت گویا اللہ کے علم وحکمت کی نشانی ہے۔آیت کا لفظ قرآن مجید میں بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی۔اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کی گواہی دے رہی ہے۔گویا ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔پھر کچھ نشانیاں ہمارے اندر ہیں۔چنانچہ فرمایا: ﴿وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝٢٠ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝٢١﴾ (الذّٰریٰت) ''اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔کیا تم کو سوجھتا نہیں؟'' مزید فرمایا: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (حٰم السجدۃ:۵۳) ''عنقریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ اُن پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''۔انگریزی میں آیت کے لیے ہم لفظ verse بول دیتے ہیں' مگر verse تو شعر کو کہتے ہیں جبکہ قرآن کی آیات نہ تو شعر ہیں' نہ مصرعے ہیں' نہ جملے ہیں۔پس بعینہٖ لفظ آیت ہی کو عام کرنا چاہیے۔ بہر حال کچھ آیاتِ آفاقی ہیں' یعنی اللہ کی نشانیاں' کچھ آیاتِ انفسی ہیں' وہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں اور آیاتِ قرآنیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ اور علم کامل کی نشانیاں ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی اکائی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جان لینا چاہیے کہ آیات کا تعین کسی گرامر' بیان یا نحو کے اصول پر نہیں ہے' اس میں کوئی اجتہاد داخل نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے ایک اصطلاح ''توقیفی'' استعمال ہوتی ہے' یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات بہت طویل بھی ہیں۔ایک آیت آیۃ الکرسی ہے جس میں مکمل دس جملے ہیں' لیکن بعض آیات حروفِ مقطعات پر بھی مشتمل ہیں۔ ﴿حٰمٓ ۝١﴾ ایک آیت ہے' حالانکہ اس کا کوئی مفہوم معلوم نہیں

ہے‘ عام زبان کے اعتبار سے اس کے معانی معین نہیں کیے جا سکتے۔ یہ تو حروفِ تہجی ہیں۔ اس کو مرکب کلام بھی نہیں کہہ سکتے‘ کیونکہ اس کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں۔ ﴿حٰمٓ ۝۱ عٓسٓقٓ ۝۲﴾ ان کو جمع نہیں کر سکتے‘ یہ توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے۔ اسی طرح ''الٓمّٓ'' کو ''اَلَمْ'' نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی آیت ہے۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھئے کہ جہاں حروفِ مقطعات میں سے ایک ایک حرف آیا ہے جیسے ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝۱﴾ ‘ ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝۱﴾‘ ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۝۱﴾ یہاں ایک حرف پر آیت نہیں بنی‘ لیکن دو دو حروف پر آیتیں بنی ہیں۔ ''حٰمٓ'' قرآن میں سات جگہ آیا ہے اور یہ مکمل آیت ہے۔ الٓمّٓ آیت ہے۔ البتہ ''الٓـرٰ'' تین حروف ہیں اور وہ آیت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کسی اصول‘ قاعدے یا اجتہاد پر نہیں ہے‘ بلکہ یہ امور کلیتہً توقیفی ہیں کہ حضور ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ البتہ پھر حضور ﷺ سے چونکہ مختلف روایات ہیں‘ اس لئے اس پہلو سے کہیں کہیں فرق واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ آیات کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے‘ لیکن بعض کے نزدیک کم وبیش ۶۲۱۶‘ بعض کے نزدیک ۶۲۳۶ اور بعض کے نزدیک ۶۶۶۶ ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ بعض سورتوں کے اندر آیات کے تعین میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ سب کسی کا اپنا اجتہاد نہیں ہے‘ بلکہ سب کے سب اعداد وشمار حضور ﷺ سے نقل ہونے کی بنیاد پر ہیں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ آیت بسم اللہ قرآن حکیم میں ۱۱۳ مرتبہ سورتوں کے شروع میں آتی ہے (کیونکہ سورتوں کی کل تعداد ۱۱۴ ہے اور ان میں سے صرف ایک سورت سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں آتی۔) اگر اس کو ہر مرتبہ شمار کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد بڑھ جائے گی‘ ہر مرتبہ شمار نہ کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد کم ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے‘ بلکہ اس میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ حروف مقطعات پر بھی آیت ہے‘ مرکباتِ ناقصہ پر بھی آیت ہے‘ جیسے ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱﴾ کہیں آیت مکمل جملہ بھی ہے‘ اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔

قرآن حکیم کی آیتیں جمع ہوتی ہیں تو سورتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورت کا لفظ ''سُـور'' سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ سورۃ الحدید میں فصیل کے معنی میں آیا ہے۔ پچھلے زمانے میں ہر شہر کے باہر‘ گرداگرد ایک فصیل ہوتی تھی جو شہر کا احاطہ کر لیتی تھی‘ شہر کی حفاظت کا کام بھی دیتی تھی اور حد بندی بھی کرتی تھی۔ آیات کو جب جمع کیا گیا تو اس سے جو فصیلیں وجود میں آئیں وہ سورتیں ہیں۔ فصل علیحدہ کرنے والی شے کو کہتے ہیں۔ تو گویا ایک سورۃ دوسری سورۃ سے علیحدہ ہو رہی ہے۔ فصیل علیحدگی کی بنیاد ہے۔ فصیل کے لئے ''سُور'' کا لفظ مستعمل ہے‘ پھر اس سے سورت بنا ہے۔ البتہ یہ سورتیں ''ابواب'' نہیں ہیں‘ بلکہ جس طرح آیت کے لئے لفظ verse مناسب نہیں اسی طرح سورت کے لئے لفظ ''باب'' یا chapter درست نہیں۔

اب جان لیجئے کہ جیسے آیات کا معاملہ ہے ایسے ہی سورتوں کا بھی ہے۔ چنانچہ سورتیں بہت چھوٹی بھی ہیں۔ قرآن مجید کی تین سورتیں صرف تین تین آیات پر مشتمل ہیں: سورۃ العصر‘ سورۃ النصر اور سورۃ الکوثر۔ جبکہ تین سورتیں ۲۰۰ سے زائد آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں۔ (سورۃ البقرۃ کی آیات کی تعداد کے اعتبار سے رائے میں فرق ہے۔) سب سے زیادہ آیات سورۃ البقرۃ میں ہیں۔ پھر سورۃ الشعراء میں ۲۲۷ اور سورۃ الاعراف میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ محققین وعلماء کا اس پر اجماع ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کا تعین بھی حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ اگرچہ ایک ضعیف سا قول ملتا ہے کہ شاید یہ کام صحابہ کرام ؓ نے کسی اجتہاد سے کیا ہو‘ مگر یہ مختار قول نہیں ہے‘ ضعیف ہے۔ اجماع اسی پر ہے کہ آیتوں کی تعیین بھی توقیفی اور سورتوں کی تعیین بھی توقیفی ہے۔

قرآن حکیم کی سات منازل

دَورِ صحابہؓ میں ہمیں ایک تقسیم اور ملتی ہے اور وہ ہے سات منزلوں کی شکل میں سورتوں کی گروپنگ۔ انہیں احزاب بھی کہتے ہیں۔ ''حزب'' کا لفظ احادیث میں ملتا ہے' لیکن وہ ایک ہی معنی میں نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنے لیے تلاوت کی ایک مقدار معین کر لیتا تھا کہ میں اتنی مقدار روزانہ پڑھوں گا۔ یہ گویا کہ اس کا اپنا حزب ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب ؓ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ مِنَ اللَّيْلِ' اَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ' فَقَرَأَهٗ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ' كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَأَهٗ مِنَ اللَّيْلِ))

(اخرجه الجماعة الا البخاری)

''جو شخص نیند (یا بیماری) کی وجہ سے رات کو (تہجد میں) اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے' پھر وہ فجر اور ظہر کے درمیان اس کی تلاوت کر لے تو اس کے لیے اتنا ہی ثواب لکھا جائے گا گویا اس نے اسے رات کے دوران پڑھا ہے''۔ (یہ حدیث بخاری کے سوا دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔)

یعنی جو شخص کسی وجہ سے کسی رات اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے' جتنا بھی نصاب اس نے معین کیا ہو' کسی بیماری کی وجہ سے' یا نیند کا غلبہ ہو جائے' تو اسے چاہیے کہ اپنی اس قراءت یا تلاوت کو وہ دن کے وقت ضرور پورا کر لے۔ صحابہ کرام ؓ میں سے اکثر کا معمول تھا کہ ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے سات حصے ایسے ہو جائیں کہ ایک حصّہ روزانہ تلاوت کریں تو ہر ہفتے قرآن مجید کا دَور مکمل ہو جائے۔ اس لیے سورتوں کے سات مجموعے یا گروپ بنا دیئے گئے۔ ان گروپوں کے لیے آج کل ہمارے ہاں جو لفظ مستعمل ہے وہ ''منزل'' ہے' لیکن احادیث و روایات میں حزب کا لفظ آتا ہے۔

احزاب یا منازل کی اس تقسیم میں بڑی خوبصورتی ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ یہ ساتوں حصّے بالکل مساوی کیے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر بات ہے کہ سورتیں ٹوٹ جاتیں' ان کی فصیلیں ختم ہو جاتیں۔ چنانچہ ہر حزب میں پوری پوری سورتیں جمع کی گئیں۔ اس طرح احزاب یا منزلوں کی مقداریں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ کچھ حزب کچھ حزب چھوٹے ہیں کچھ بڑے ہیں' لیکن ان کے اندر سورتوں کی فصیلیں نہیں ٹوٹیں' یہ ان کا حسن ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شے بھی شاید اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منزلوں کی تعیین بھی توقیفی ہے' لیکن منزلوں کی اس تقسیم میں ادبی اعتبار سے جو حسن پیدا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو الگ رکھ دیا جائے کہ یہ تو قرآن حکیم کا مقدمہ یا دیباچہ ہے تو اس کے بعد پہلا حزب یا منزل تین سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء) پر مشتمل ہے۔ دوسری منزل پانچ سورتوں پر' تیسری منزل سات سورتوں پر' چوتھی منزل نو سورتوں پر' پانچویں منزل گیارہ سورتوں پر اور چھٹی منزل تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے' جبکہ ساتویں منزل (حزبِ مفصل) جو کہ آخری منزل ہے' اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ آخر میں سورتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ یاد رہے کہ ۶۵ بھی ۱۳ کا multiple بنتا ہے (۶۵ = ۵×۱۳)۔ سورتوں کی تعداد جیسا کہ ذکر ہو چکا ۱۱۴ ہے۔ یہ تعداد متفق علیہ ہے' جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

آج کل جو قرآن مجید حکومت سعودی عرب کے زیر اہتمام بہت بڑی تعداد میں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے شائع ہوتا ہے' اس میں حزب کا لفظ بالکل ایک نئے معنی میں آیا ہے۔ انہوں نے ہر پارے کو دو حزب میں تقسیم کر لیا ہے' گویا نصف پارے کی بجائے لفظ حزب ہے۔ پھر وہ حزب بھی چار

حصّوں میں منقسم ہے: رُبع الحزب، نصفُ الحزب اور پھر ثلاثۃُ ارباعِ الحزب۔ اس طرح انہوں نے ہر پارے کے آٹھ حصے بنالیے ہیں۔ یہ لفظ حزب کا بالکل نیا استعمال ہے۔ اس کی کیا سند اور دلیل ہے اور یہ کہاں سے ماخوذ ہے، یہ میرے علم میں نہیں ہے۔

انسانی کلام حروف و اصوات سے مرتب ہوتا ہے اور ہر زبان میں حروفِ ہجائیہ ہوتے ہیں۔ پھر حروف مل کر کلمات بناتے ہیں۔ کلمات سے کلام وجود میں آتا ہے، خواہ وہ کلام منظوم ہو یا نثر ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی ترکیب ہے۔ حروف سے مل کر کلمات بنے، کلمات نے آیات کی شکل اختیار کی، آیات جمع ہوئیں سورتوں کی شکل میں اور سورتیں جمع ہوگئیں منزلوں کی شکل میں۔

رکوعوں اور پاروں کی تقسیم

سورتوں کی پہلی تقسیم رکوعوں میں ہے۔ یہ تقسیم دورِ صحابہؓ اور دورِ نبویؐ میں موجود نہیں تھی۔ یہ تقسیمیں زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں۔ رکوعوں کی تقسیم بڑی سورتوں میں کی گئی۔ ۳۵ سورتیں ایسی ہیں جو ایک ہی رکوع پر مشتمل ہیں، یعنی وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ انہیں ایک رکعت میں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے، لیکن بقیہ سورتیں طویل ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں اور اس کے ۴۰ رکوع ہیں۔ حضور ﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ایک رات ان تین سورتوں (البقرۃ، آلِ عمران، النساء) کی منزل ایک رکعت میں مکمل کی ہے۔ لیکن یہ تو استثناءات کی بات ہے۔ عام طور پر تلاوت کی وہ مقدار جو ایک رکعت میں بآسانی پڑھی جاسکتی ہو ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ رکوع رکعت سے ہی بنا ہے۔ یہ تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تقسیم بڑی محنت سے معانی پر غور کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ کسی مقام پر ایک مضمون مکمل ہوگیا اور دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے تو وہاں اگر رکوع کرلیا جائے تو بات ٹوٹے گی نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر ائمہ مساجد پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے، عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے، لہٰذا اکثر ایسی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی جگہ پر رکوع کردیتے ہیں جہاں کلام کا ربط منقطع ہوجاتا ہے۔ پھر اگلی رکعت میں وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے بات معنوی اعتبار سے بہت ہی گراں گزرتی ہے۔ رکوعوں کی تقسیم بالعموم بہت عمدہ ہے، لیکن چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت یہاں سے ہٹا کر رکوع ماقبل میں شامل کی گئی ہوتی یا رکوع کا نشان اس آیت سے پہلے ہوتا تو معانی اور مفہوم کے اعتبار سے بہتر ہوتا۔ بہرحال اکثر و بیشتر رکوعوں کی تقسیم معنوی اعتبار سے صحیح ہے جو بڑی محنت سے گہرائی میں غور کرکے کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک تقسیم پاروں کی شکل میں ہے۔ یہ تقسیم تو اور بھی بعد کے زمانے کی ہے اور بڑی بھونڈی تقسیم ہے، اس لیے کہ اس میں سورتوں کی فصیلیں توڑ دی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا جوشِ ایمان کم ہوا اور لوگوں نے معمول بنانا چاہا کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ قرآن ختم کرلیں تب اُن کو ضرورت پیش آئی کہ اس کو تیس حصّوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی نے غالباً یہ حرکت کی کہ اُس کے پاس جو مصحف موجود تھا اُس نے اس کے صفحے گن کر تیس پر تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح جہاں بھی صفحہ کٹ گیا وہیں نشان لگا دیا اور اگلا پارہ شروع ہوگیا۔ اس بھونڈی تقسیم کی مثال دیکھئے کہ سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں ہے باقی پوری سورت چودہویں پارے میں ہے۔ ہمارے ہاں جو مصحف ہیں ان میں آپ کو یہی شکل نظر آئے گی۔ سعودی عرب سے جو قرآن مجید بڑی تعداد میں شائع ہوکر پوری دنیا میں پھیلا ہے، یہ اب پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسی انداز سے شائع کیا جاتا ہے جس سے کہ ہم مانوس ہیں۔ البتہ اہل عرب کے لیے جو قرآن مجید شائع کیا جاتا ہے اس میں رموزِ اوقاف اور علاماتِ ضبط بھی مختلف ہیں اور اس میں چودھواں جزء سورۃ الحجر سے شروع کیا جاتا ہے۔ گویا وہ تقسیم جو ہمارے ہاں ہے اس میں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے، اگرچہ پاروں کی تقسیم باقی رکھی ہے۔ بعض دوسرے عرب ممالک سے جو قرآن مجید شائع ہوتے ہیں۔ ان میں پاروں کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی متفق علیہ چیز نہیں ہے اور زمانۂ تابعین میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، یہ اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود

ؓ اور حضرت عمران بن حصین ؓ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:((خَیْرُ النَّاسِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ)) اس حدیث کی رو سے بہترین ادوار تین ہی ہیں — دورِ صحابہ' دورِ تابعین' پھر دورِ تبع تابعین۔ ان تین زمانوں کو ہم ''قرونٌ مشھودٌ لھا بالخیر'' کہتے ہیں۔ باقی اس کے بعد کا معاملہ حجت نہیں ہے' اس کی دین کے اندر کوئی مستقل اور دائمی اہمیت نہیں ہے۔

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کا اختلاف

قرآن حکیم کی ترتیب کے ضمن میں پہلی بات جو بالکل متفق علیہ اور ہر شک وشبہ سے بالا ہے وہ یہ ہے کہ ترتیبِ نزولی بالکل مختلف ہے اور ترتیبِ مصحف بالکل مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئیں وہ آخر میں درج ہیں اور ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی ہیں (البقرۃ' آل عمران' النساء' المائدۃ) ان کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف مختلف ہے۔

جہاں تک ترتیبِ نزولی کا تعلق ہے' اس سے ہر طالب علم کو دلچسپی ہوتی ہے جو قرآن مجید پر غور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کے معانی اور مفاہیم کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک خاص پس منظر کے ساتھ سورتیں جڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ابتدا میں کیا حالات تھے جن میں یہ سورتیں نازل ہوئیں' پھر حالات نے کیا پلٹا کھایا تو اگلی سورتیں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کو مرتب کیا جائے تو ایک اعتبار سے وہ سیرت النبیؐ کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد سے لے کر آپؐ کے انتقال تک وہ زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس پورے زمانے کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا جو مجموعی ربط ہے ترتیبِ نزولی کی مدد سے اسے سمجھنے اور غور وفکر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس قرآن مجید کے ہر طالب علم کو اس سے دلچسپی ہونا سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ ؓ کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ انہوں نے ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا تھا۔ حضرت علی ؓ کے بارے میں یہ بات بہت شد و مد کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بھی اس کو ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا' اور عوام کی سطح پر یہ مشہور ہے کہ اہل تشیع اسی کو اصل اور مستند قرآن مانتے ہیں اور حضرت علی ؓ کا یہ مصحف ان کے بارہویں امام کے پاس ہے' جو ایک غار میں روپوش ہیں۔ قیامت کے قریب جب وہ ظاہر ہوں گے تب وہ اپنا یہ مصحف یعنی ''اصل قرآن'' لے کر آئیں گے۔ گویا اہل تشیع یہ قرآن اُس وقت تک کے لیے ہی قبول کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کی طرف یہی بات منسوب ہے' لیکن دورِ حاضر کے بعض شیعہ علماء اس تصور کے قائل نہیں ہیں۔ ایک شیعہ عالم دین سید ہادی علی نقوی نے بہت شدّ ومدّ کے ساتھ اس تصور کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ ''ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں' یہی اصل قرآن ہے اور اسے من وعن محفوظ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کوئی آیت اس سے خارج نہیں ہوئی اور کوئی شے باہر سے بعد میں اس میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی جو دو تختیوں کے مابین ہے' یہی درحقیقت قرآن ہے''۔

بہرحال اگر حضرت علی ؓ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا جسے آپ نے ترتیبِ نزولی کے مطابق مرتب کیا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ علمی اور تحقیقی اعتبار سے قرآن حکیم پر غور وفکر کرنے کے لیے قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم میں بھی ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے سورتوں کو مرتب کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (محمد عزۃ دروزۃ نے بھی اپنی تفسیر ''التفسیر الحدیث'' میں سورتوں کو نزولی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔) علمی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن اصل حجیت ترتیبِ مصحف کی ہے۔ یہ ترتیب توقیفی ہے۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب ہے اور یہی ترتیب لوحِ محفوظ میں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ ﴿۷۷﴾ فِیْ کِتٰبٍ مَّکْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾﴾ (الواقعۃ) اور ﴿بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ﴿۲۱﴾ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾﴾ (البروج) ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں جلال الدین سیوطی نے بہت ہی زور اور تاکید کے ساتھ کسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر کوشش کر لیں تب بھی ترتیبِ نزولی پر قرآن کو مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس مکمل معلومات نہیں

ہیں۔ بہت سی سورتوں کے اندر بعد میں نازل ہونی والی آیات پہلے آ گئی ہیں اور شروع میں نازل ہونی والی بعد میں آئی ہیں۔ اس اعتبار سے ایک ایک آیت کے بارے میں معین کرنا اور اس کی ترتیب کے بارے میں اجماع ناممکن ہے۔ چنانچہ اصل مصحف وہی ہے جو ہمارے پاس ہے اور اس کی ترتیب بھی توقیفی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے۔

اس ترتیب مصحف کے اعتبار سے اِس دور میں سورتوں کی ایک نئی گروپنگ کی طرف راہنمائی ہوئی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے خاص طور پر اپنی توجہ کو نظم قرآن پر مرکوز کیا' آیات کا باہمی ربط تلاش کیا۔ نیز یہ کہ آیتوں کی وہ کون سی قدر مشترک ہے جس کی بناء پر ان کو سورتوں میں جمع کیا گیا —— پھر یہ کہ ہر سورۃ کا ایک عمود اور مرکزی مضمون ہے' بظاہر آیات غیر مربوط نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت اُن کے مابین ایک منطقی ربط موجود ہے اور ہر آیت اس سورۃ کے عمود کے ساتھ مربوط ہے —— مزید یہ کہ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں —— ان چیزوں پر مولانا فراہیؒ نے زیادہ توجہ کی۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس بات کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

اس ضمن میں ایک اشتباہ پیدا ہوسکتا ہے' جسے رفع کردینا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا یہ پہلو اس زمانے میں کیوں سامنے آیا اور اس سے پہلے اس پر غور کیوں نہیں ہوسکا؟ کیا ہمارے اسلاف قرآن مجید پر تدبر کا حق ادا نہیں کرتے تھے؟ اس اشتباہ کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ حضور ﷺ کا اپنا قول ہے کہ ''لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ''۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دور کے محدثین' محققین' مفسرین قرآن مجید کے علم کا بتمام وکمال احاطہ کر چکے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ قرآن مجید پر بھی طعن ہوتا اور خود حضورؐ کے اس قول کی بھی نفی ہوتی۔ یہ تو جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا قرآن مجید کے عجائب' اس کی حکمتیں' اس کے علوم و معارف کے نئے نئے خزانے برآمد ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ مطالعہ قرآن کے بعد ہم یہ محسوس کریں کہ ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کو سیکھا ہے اور بعد میں آنے والے اس میں سے کچھ اور بھی حاصل کریں گے' وہ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہیں گے' اس میں غور و فکر اور تدبر کرتے رہیں گے اور نئے نئے علوم اور نئے نئے نکات اس میں سے برآمد ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہی زمانہ اس انکشاف کے لیے معین تھا' اور ظاہر بات ہے کہ حکمتِ قرآنی کا جو بھی کوئی نیا پہلو دریافت ہوگا وہ کسی انسان ہی کے ذریعے سے ہوگا۔ لہٰذا اس کے لیے طبیعت کے اندر بُعد محسوس نہ کریں۔ بہرحال مولانا فراہیؒ نے نظم قرآن کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ وہ تفسیر قرآن لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں سکے' صرف چند سورتوں کی تفاسیر انہوں نے لکھی ہیں۔ ان میں سے بھی بعض نامکمل ہیں۔ وہ ایک مفکر قسم کے انسان تھے' مصنف قسم کے انسان نہیں تھے۔ مفکر انسان مسلسل غور کرتا رہتا ہے اور اس کے سامنے نئے نئے پہلو آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا تصنیف و تالیف کا انداز یہ تھا کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر فائل کھول رکھے تھے۔ جب کوئی نیا خیال آتا تو کاغذ پر لکھ کر متعلقہ فائل میں شامل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف ان کی وفات کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں' جبکہ ان کے زمانے میں وہ صرف فائلوں کی شکل میں تھیں اور کسی شے کے چھپنے کی نوبت آئی ہی نہیں۔ سوچ و بچار کا تسلسل ان کے آخری لمحے تک جاری رہا۔ ''مقدمہ نظام القرآن'' واقعتاً ان کے فکر اور سوچ کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد رشید امین احسن اصلاحی صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے۔ نظم قرآن کے بارے میں ان حضرات کے نتیجۂ فکر کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

(i) ہر سورت کا ایک عمود ہے' جیسے ایک ہار کی ڈوری ہے اور اس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔ یہ ڈوری دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی' موتی نظر آتے ہیں' لیکن ان کو باندھنے والی شے تو ڈوری ہے جس میں وہ پروئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہے جس کے ساتھ اس کی تمام آیات مربوط ہیں۔

(ii) قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کا ایک رخ ایک سورت میں آ جاتا ہے اور اسی کا دوسرا رخ اس جوڑے کے دوسرے حصّے میں آ کر مضمون کی تکمیل کر دیتا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ البتہ جہاں تک اس اصول کے انطباق کا تعلق ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور جو حضرات میرے دروس میں تسلسل سے شرکت کرتے رہے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مجھے بہت سے مواقع پر اصلاحی صاحب سے اختلاف بھی ہے' لیکن اصولاً یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ تاہم بعض سورتیں منفرد حیثیت کی مالک ہیں' ان کا جوڑا اس جگہ پر موجود نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے تحقیق کی ہے کہ اکثر و بیشتر ایسی سورتوں کے جوڑے بھی معناً قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ النور تنہا اور منفرد ہے' سورۃ الاحزاب بھی منفرد اور تنہا ہے' لیکن یہ دونوں آپس میں جوڑے ہیں اور ان میں جوڑے ہونے کی نسبت بتمام وکمال موجود ہے۔ اسی طرح سورۃ الفاتحہ منفرد ہے۔ وہ تو اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ واقعتاً اس کا بتمام وکمال جوڑا بننا ممکن نہیں' وہ اپنی جگہ پر قرآن حکیم اور سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ ہے' لیکن سورۃ الناس میں غور کریں تو معناً یہ سورت سورۃ الفاتحہ کا جوڑا بنتی ہے۔ اس لیے کہ سورۃ الفاتحہ میں استعانت ہے اور سورۃ الناس میں استعاذہ۔ پھر سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تین شانیں رَبّ' مَلِک' الٰہ ہیں اور یہی تین شانیں سورۃ الناس میں بھی ہیں۔

(iii) تلاوت کے لیے سات منزلوں کے علاوہ قرآن حکیم میں سورتوں کی ایک معنوی گروپنگ بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی سورتوں کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ میں مکی اور مدنی دونوں طرح کی سورتیں شامل ہیں۔ ہر گروپ میں ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں ہیں۔ ایک گروپ کی مکی اور مدنی سورتوں میں وہی نسبت ہے جو ایک جوڑے کی دو سورتوں میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضمون کی تکمیل ایک جوڑے کی سورتوں میں ہوتی ہے' یعنی ایک رُخ ایک فرد میں اور دوسرا رُخ دوسرے فرد میں' اسی طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون اور عمود ہے' جس کا ایک رُخ مکی سورتوں میں اور دوسرا رخ مدنی سورتوں میں آ جاتا ہے۔ اس طرح غور وفکر اور تدبر کے نئے میدان کھل رہے ہیں۔ جو انسان بھی ان کا عمود معین کرنے میں غور وفکر کرے گا وہ کسی نتیجے پر پہنچے گا' اگرچہ عمود معین کرنے میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ سب سے بڑا گروپ پہلا ہے جس میں مکی سورت صرف ایک یعنی سورۃ الفاتحہ جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں' یعنی سورۃ البقرۃ' آل عمران' النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکی اور دو مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکیات ہیں' جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ میں سورۂ یونس سے سورۃ المؤمنون تک چودہ مکی سورتیں ہیں۔ یہ تقریباً سات پارے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مدنی سورت ہے اور وہ سورۃ النور ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے سورۃ السجدۃ تک مکیات ہیں' پھر ایک مدنی سورت سورۃ الاحزاب ہے۔ پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے سورۃ الاحقاف تک مکیات ہیں' پھر تین مدنی سورتیں' سورۂ محمد' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ہیں۔ اس کے بعد چھٹے گروپ میں پھر سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکیات ہیں جن کے بعد پھر دس مدنیات ہیں (سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم)۔ اسی طرح ساتویں گروپ میں بھی پہلے مکی سورتیں ہیں اور آخر میں دو مدنی سورتیں۔ اس طرح یہ سات گروپ بنتے ہیں۔ یہ گروپ مولانا اصلاحی صاحب کے مرتب کردہ ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری گروپ اس اعتبار سے عکسی نسبت رکھتے ہیں کہ پہلے گروپ میں صرف ایک سورت سورۃ الفاتحہ مکی ہے اور سوا چھ پاروں پر مشتمل چار طویل ترین سورتیں مدنی ہیں' جبکہ آخری گروپ میں سورۃ الملک سے لے کر پورے دو پارے تقریباً مکیات پر مشتمل ہیں' آخر میں صرف دو سورتیں ''معوذتین'' مدنی ہیں۔ یعنی یہاں نسبت بالکل عکسی ہے۔ لیکن دوسرا گروپ بھی متوازن ہے' یعنی دو سورتیں مکی' دو مدنی ——— اور چھٹا گروپ بھی متوازن ہے کہ اس میں سات سورتیں مکی ہیں (سورۃ ق سے سورۃ الواقعہ تک) جبکہ دس سورتیں مدنی ہیں (سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک) لیکن حجم کے اعتبار سے تقریباً برابر ہیں۔ یہ بھی غور وفکر اور سوچ بچار کا ایک موضوع ہے اور اس سے بھی قرآن مجید کی حکمت و ہدایت اور اس کے

علم کے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے ہونے کا معاملہ قرآن مجید میں بعض جگہوں پر تو بہت ہی نمایاں ہے۔ ''المُعوَّ ذَتین'' آخری دو سورتیں ہیں جو تعوّذ پر مشتمل ہیں: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝﴾ اور ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝﴾۔ اسی طرح الزّهراوَین ''دونہایت تابناک سورتیں'' سورۃ البقرۃ اور آلِ عمران ہیں۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کو بھی ایک نام دیا جیسے آخری دو سورتوں کو ایک نام دیا۔ اسی طرح سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر میں اور سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح میں معنوی ربط ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں تو یہ ربط بہت ہی نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾۔ مضمون کے اندر بھی بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کے بعد سورۃ الصّف اور سورۃ الجمعہ کا جوڑا ہے۔ سورۃ الصّف سَبَّحَ لِلّٰهِ سے اور سورۃ الجمعہ یُسَبِّحُ لِلّٰهِ کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ الصّف کی مرکزی آیت جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾ ہے جبکہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت جو حضور ﷺ کے انقلاب کا اساسی منہاج معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ہے۔ بہر حال سورتوں کا جوڑا ہونا' سورتوں کا گروپ کی شکل میں ہونا' ان گروپس کا اپنا ایک عمود اور ایک مرکزی مضمون ہونا' پھر اس کے دو رخ بن جانا جو اُس کی مکیات اور مدنیات میں آتے ہیں' قرآن مجید کے علم و حکمت کے خزانے کے وہ دروازے ہیں جو اَب کھلے ہیں۔ اس طرح کے دروازے ہر دور میں کھلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کھلتے رہیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید پر تذکر اور تدبر تسلسل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔

پیچھے سات منزلوں اور سات احزاب کا ذکر ہو چکا۔ اب مکی اور مدنی سورتوں کے سات گروپس کا بیان ہوا۔ یہ دونوں قسم کے گروپ دو جگہ پر آ کر مل جاتے ہیں۔ پہلی منزل تو سورۃ النساء پر ختم ہو جاتی ہے اور پہلا گروپ سورۃ المائدۃ پر ختم ہوتا ہے۔ سورۃ التوبۃ پر دوسری منزل بھی ختم ہوتی ہے اور دوسرا گروپ بھی ختم ہوتا ہے۔ سورۂ یونس سے تیسری منزل شروع ہوتی ہے اور تیسرا گروپ بھی شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام اور ہے۔ سورۂ ق سے آخری منزل بھی شروع ہو رہی ہے اور اسی سے چھٹا گروپ بھی شروع ہو رہا ہے۔ سورۂ ق چھٹے گروپ کی پہلی مکی سورۃ ہے۔ یہ چھٹا گروپ سورۃ التحریم پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری گروپ سورۃ الملک سے شروع ہوتا ہے' لیکن جو منزل سورۂ ق سے شروع ہوتی ہے وہ سورۃ الناس تک ایک ہی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو معلومات کے درجے میں سامنے رہیں اور ذہن میں موجود رہیں تو انسان جب غور کرتا ہے تو ان کے حوالے سے بعض اوقات حکمت کے بڑے قیمتی موتی ہاتھ لگتے ہیں۔

تدوینِ قرآن

قرآن مجید کی تدوین کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہو گئی تھی۔ کسی شاعر کا دیوان اس کی غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کی بھی تدوین ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک دیوان کی شکل میں ہے' اس کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ جمع و تدوینِ قرآن اپنی جگہ پر بہت اہم موضوع ہے۔ اس کے بارے میں خاص معلومات ہمارے ذہنوں میں ہر وقت مستحضر رہنی چاہئیں' کیونکہ عام طور پر اہل تشیع کے حوالے سے ہمارے ہاں جو چیزیں مشہور ہیں (واللہ اعلم وہ حقیقت پر مبنی ہیں یا محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے) ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوئے ہیں اور وہ کافی بڑے حلقے کے اندر پھیلے ہیں۔

ہمارے ہاں جمعے کے خطبے جو مرتب کیے گئے ہیں اور عام خطیب پڑھتے ہیں‘ ان میں بھی ایسے الفاظ آ گئے ہیں جو بہت بڑے بڑے مغالطوں کی بنیاد بن گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی دشمن اسلام نے‘ کسی باطنی نے‘ کسی غالی قسم کے رافضی نے یہ الفاظ شامل کر دیئے ہوں۔ بظاہر تعریف ہو رہی ہے مگر حقیقت میں تنقیص ہو رہی ہے اور دین کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بھی اسی تدوین کے ذیل میں آئے گی۔

قرآن حکیم کی تدوین تین مراحل میں مکمل ہوئی۔ پہلی تدوین رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوگئی تھی‘ لیکن وہ تدوین اس شکل میں تھی کہ سورتیں معین ہوگئیں‘ سورتوں کی ترتیب معین ہوگئی۔ کتابی شکل میں قرآن مجید حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس مختلف حصّوں میں لکھا ہوا قرآن تھا۔ لوگ اونٹ کے شانے کی ہڈی (جو کافی چوڑی ہوتی ہے) پر لکھتے تھے یا کولہے کی ہڈی پر لکھا جاتا تھا۔ اونٹ کی پسلیاں (ribs) بھی بڑی چوڑی ہوتی ہیں‘ یہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ کاغذ اس زمانے میں کہاں تھا‘ کپڑا زیادہ دستیاب تھا‘ لہٰذا کپڑے پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بھی آیات لکھ لیتے تھے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید کی اصل حیثیت ”قول“ کی ہے۔ ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿٤٠﴾﴾ (الحاقۃ) نہ تو یہ حضور ﷺ کو لکھی ہوئی شکل میں دیا گیا نہ حضور ﷺ نے لکھی ہوئی شکل میں اُمت کو دیا۔ حضور ﷺ کو بھی یہ پڑھایا گیا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿٦﴾﴾ (الاعلیٰ) ”ہم آپ کو پڑھائیں گے‘ پھر آپ بھولیں گے نہیں“۔ یہ اوّلاً قولِ جبرائیلؑ پھر قولِ محمد ﷺ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جبرائیل علیہ السلام سے حضور ﷺ نے سنا‘ حضورؐ سے صحابہؓ نے سنا۔ چنانچہ اصل میں تو قرآن پڑھی جانے والی شے ہے۔ لیکن جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا آپ اسے لکھوا بھی لیتے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتابتِ وحی کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ اور حضور ﷺ نے اس بات کا حکم بھی دے دیا تھا کہ ((لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْآنِ)) ”میری طرف سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو“۔

احادیث کو لکھنے سے حضور ﷺ نے منع فرما دیا تھا تاکہ کہیں اللہ اور رسولؐ کا کلام گڈمڈ نہ ہو جائے‘ صرف قرآن مجید کو ہی لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن اصل قرآن اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے سینے میں جمع کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے سینوں میں جمع کر دیا۔ وہ قول سے قول کی شکل میں گیا ہے‘ لوگوں نے حضور ﷺ کے دہن مبارک سے سیکھا ہے۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کے دور میں لکھا ہوا قرآن بھی تھا لیکن کتابی شکل میں جمع شدہ نہیں تھا۔ جمع شدہ شکل میں صرف سینوں میں تھا‘ حفاظ کو یاد تھا۔ انہیں یاد تھا کہ قرآن اس ترتیب کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیح روایات کے مطابق ہر رمضان المبارک میں جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا‘ حضور ﷺ اور حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کا دَور کرتے تھے‘ جیسا کہ ہمارے ہاں رمضان کے آنے سے پہلے حفاظ دَور کرتے ہیں‘ ایک حافظ سناتا ہے‘ دوسرا سنتا ہے تاکہ تراویح میں سنانے کے لیے تازہ ہو جائے۔ تو رمضان المبارک میں حضور ﷺ اور حضرت جبرائیلؑ مذاکرہ کرتے تھے‘ قرآن مجید کا دورہ ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں آپؐ نے حضرت جبرائیلؑ سے قرآن مجید کا دو مرتبہ مکمل دَور کیا۔ چنانچہ جہاں تک حافظے میں اور سینے میں قرآن کا مدون ہو جانا ہے وہ تو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مکمل ہو گیا تھا۔

تدوینِ قرآن کا دوسرا مرحلہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں آیا جب مرتدین اور مانعین زکوٰۃ سے جنگیں ہوئیں۔ جنگ یمامہ میں تو بہت بڑی تعداد میں صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ یہ بڑی خون ریز جنگ تھی اور اس میں کثیر تعداد میں حفاظِ قرآن شہید ہو گئے تو تشویش پیدا ہوئی اور یہ خیال آیا کہ اس قرآن کو اب کتابی شکل میں جمع کر لینا چاہیے۔ یہ خیال سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہی تو وہ بڑے متردّد ہوئے کہ میں وہ کام کیسے کروں جو حضور ﷺ نے نہیں کیا! لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اصرار کرتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اس پر انشراحِ صدر ہو گیا۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اب تمہاری اس بات کے لیے اللہ نے میرے سینے کو کشادہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ پر ڈالی گئی جو حضور ﷺ کے زمانے میں کاتب وحی تھے۔ آپ ﷺ کے چند خاص صحابہ جو کتابتِ وحی پر مامور تھے

ان میں حضرت زید بن ثابتؓ بہت معروف تھے۔ ان سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم یہ کام کرو' اور ان کے ساتھ کچھ اور صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دے دی۔ وہ بھی پہلے بہت متردّد رہے۔ ان کی دلیل بھی یہ تھی کہ جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں! علاوہ ازیں یہ تو پہاڑ جیسی ذمہ داری ہے' یہ میں کیسے اٹھاؤں! لیکن جب حضرات ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما دونوں کا اصرار ہوا تو ان کا بھی سینہ کھل گیا۔ پھر جن صحابہؓ کے پاس قرآن حکیم کا جو حصہ بھی لکھی ہوئی شکل میں تھا' ان سے لیا گیا اور مختلف شہادتوں اور حفاظ کی مدد سے عہد صدیقی میں قرآن پاک کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیا گیا۔ یاد رہے کہ ایک کتاب کی شکل میں بھی قرآن مجید کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے دو سال کے اندر اندر مکمل ہو گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کا عہد خلافت کل سوا دو برس ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیر غور آیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تو قرآن ایک جلد کے مابین جمع نہیں کیا گیا' لہٰذا اس کا نام کیا رکھا جائے! ایک تجویز یہ آئی کہ اسے بھی انجیل کا نام دیا جائے۔ ایک رائے یہ دی گئی کہ اس کا نام ''سِفر'' ہو' اس لیے کہ سفر کا لفظ تورات کی کتابوں کے لیے معروف چلا آ رہا تھا' جیسے سفر ایوب ایک کتاب تھی۔ تو سِفر کتاب کو کہتے ہیں جس کی جمع ''اَسفار'' ہے اور یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ سفر کا لفظی مطلب ہے روشنی دینے والی۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے تجویز پیش کی کہ اس کا نام ''مصحف'' ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میرا آنا جانا حبشہ ہوتا ہے' وہاں کے لوگوں کے پاس ایک کتاب ہے اور وہ اسے مصحف کہتے ہیں۔ اب ''مصحف'' کے لفظ پر اتفاق و اجماع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کے لیے حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تجویز پر مصحف نام رکھا گیا اور اس پر لوگوں کا اجماع ہوا۔ تدوین قرآن کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت کے ضمن میں ایک معاملہ چلا آ رہا تھا' جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ عربوں کی زبان تو ایک تھی لیکن بولیاں مختلف تھیں' الفاظ کے لہجے مختلف تھے۔ تو سب لوگوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے لہجے کے اندر قرآن پڑھ لیا کریں تا کہ سہولت رہے' ورنہ بڑی مشقت کی ضرورت تھی کہ سب لوگ اپنے لہجے بدلیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلابی جدوجہد کا tempo اتنا تیز تھا کہ ان کاموں کے لیے زیادہ فرصت نہیں تھی کہ اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم ہوں' مختلف جگہوں سے لوگ آئیں اور اپنا لہجہ بدل کر قریش کے لہجے کے مطابق کریں' حجازی لہجہ اختیار کریں۔ چنانچہ اجازت دی گئی تھی کہ اپنے اپنے لہجوں میں پڑھ لیں۔ مختلف لہجوں میں پڑھنے کے ساتھ کچھ لفظی فرق بھی آنے لگے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ مختلف لہجوں میں لفظی فرق کے ساتھ بھی قرآن پڑھا جانے لگا۔ کوئی شخص قرآن پڑھ رہا ہوتا' دوسرا کہتا کہ یہ غلط پڑھ رہا ہے' یہ یوں نہیں ہے' جیسے میں پڑھ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ اس پر اس جذباتی قوم کے اندر تلواریں نکل آتی تھیں۔ اندیشہ ہوا کہ اگر اس طرح سے یہ بات پھیل گئی تو قرآن کا کوئی ایک ٹیکسٹ متفق علیہ نہیں رہے گا۔ امت کو جمع کرنے والی شے تو یہ قرآن ہی ہے' اس میں لفظی فرق کے نتیجے میں دائمی افتراق و انتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے طے کیا کہ قرآن کا ایک ٹیکسٹ تیار کیا جائے۔ اس ٹیکسٹ کے لیے لفظ ''رسم'' ہے۔ رسم الخط کا لفظ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ''اب ت'' حروف ہیں' لیکن عربی میں لکھے جائیں گے تو ان کا رسم الخط کچھ اور ہے' اردو میں لکھے جائیں گے تو ان کی شکل اور ہے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر قرآن جمع کیا۔ انہوں نے بھی ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کو یہ حکم دے دیا گیا کہ تمام لہجوں کو رد کر کے قریش کے لہجہ پر قرآن کا ٹیکسٹ تیار کیا جائے جو متفق علیہ ٹیکسٹ ہو گا۔ چنانچہ اس کمیٹی نے بڑی محنت شاقہ سے اس کام کی تکمیل کی۔ اس طرح قرآن کا رسم الخط معین ہو گیا اور ایک متفق علیہ ٹیکسٹ وجود میں آ گیا۔ رسم عثمانی کے مطابق سورۃ الفاتحہ میں ''ملك يوم الدين'' لکھا جائے گا' لکھنے کی شکل یہ نہیں ہو گی: "مالك يوم الدين"۔ ایک قراءت میں چونکہ مَلِكِ بھی ہے تو ''ملك'' کو ''مٰـلِكِ'' بھی پڑھا جا سکتا ہے اور ''مَـلِكِ'' بھی۔ تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے سرانجام دیا کہ قرآن کا

ایک رسم الخط معین ہو گیا اور مصاحف عثمان تیار ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق اس کی چار نقول تیار کی گئیں، بعض روایات کے مطابق پانچ اور بعض میں سات کا عدد بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک مصحف official version کے طور پر مدینے میں رکھا گیا اور باقی نقلیں مکہ مکرمہ، دمشق، کوفہ، یمن، بحرین اور بصرہ کو بھیج دی گئیں۔ ان میں سے کوئی کوئی نقل اب بھی موجود ہے۔ ترکی اور تاشقند میں وہ ''مصاحفِ عثمانی'' موجود ہیں جو حضرت عثمان ؓ نے تیار کرائے تھے۔

یہاں ایک اہم بات توجہ طلب ہے کہ ہمارے ہاں خطباتِ جمعہ میں بعض خطیب یہ جملہ پڑھ جاتے ہیں: ''**جامعُ آیاتِ القرآن عثمان بن عفان** ؓ''۔ یہاں ہم قافیہ الفاظ جمع کر کے صوتی آہنگ کے ساتھ ایک خاص انداز پیدا کیا گیا ہے، لیکن یہ الفاظ اس قدر غلط اور اتنے گمراہ کن ہیں کہ اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ آیات قرآنیہ کو سب سے پہلے حضرت عثمان ؓ نے جمع کیا۔ یہ بات قرآن پر سے اعتماد کو ہٹا دینے والی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمع ہو چکی تھیں، سورتیں حضورؐ کے زمانے میں وجود میں آ چکی تھیں، سورتوں کی تدوین ہی نہیں ترتیب بھی حضور ﷺ کے زمانے میں عمل میں آ چکی تھی۔ کتابی شکل میں قرآن ابوبکر ؓ کے زمانے میں جمع ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں دس پندرہ سال کا فصل ہے۔ اگر ''**جامعُ آیاتِ القرآن**'' حضرت عثمان ؓ کو قرار دیا جائے تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے پندرہ یا بیس برس بعد ہوئی ہے۔ حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت بارہ برس ہے اور حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس بعد ان کا انتقال ہوا۔ تو اس طرح قرآن کے متن (text) کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان ؓ آیاتِ قرآنی کے جمع کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اُمت کو قرآن کے ایک ٹیکسٹ اور رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ اسی لیے آج دنیا میں جو مصحف موجود ہے یہ ''مصحف عثمان'' کہلاتا ہے۔ اس کا نام ''مصحف'' حضرت ابوبکر ؓ نے رکھا تھا اور مصحف عثمان میں رسم الخط اور ٹیکسٹ معین ہو گیا کہ اب قرآن اسی طریقے سے لکھا جائے گا اور یہی پوری دنیا کے اندر official ٹیکسٹ ہے۔

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر قرآن پاک کی اشاعت کے ادارے رسم عثمانی کا پورا اہتمام نہیں کرتے اور اس اعتبار سے ان میں رسم کی غلطیاں بھی آ جاتی ہیں، اس لیے کہ ان کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں یعنی کم خرچ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش ـــــ لیکن اب سعودی حکومت نے اس کا اہتمام کر کے بڑی نیکی کمائی ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کے حوالے سے ایک نیکی مصر نے کمائی تھی۔ جب اسرائیل نے قراءتِ قرآن مجید کے اندر تحریف کر کے اس کو عام کرنے کی کوشش کی تو حکومت مصر نے اپنے چوٹی کے قراء، قاری محمود خلیل حُصری اور عبدالباسط عبدالصمد سے پورا قرآن مجید مختلف قراءتوں میں تلاوت کرایا اور ان کے کیسٹس تیار کر کے دنیا میں پھیلا دیئے کہ اب گویا وہ ریفرنس کا کام دیں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے اب کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس طرح قراءت کے حوالے سے قرآن میں کوئی تحریف کر سکے۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت نے کروڑوں روپے کے خرچ سے بہت بڑی فاؤنڈیشن بنائی ہے، جس کے زیر اہتمام بڑے عمدہ آرٹ پیپر پر عالمی معیار کی بڑی عمدہ جلد کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں یہ قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں، جو حضرت عثمان ؓ کے معین کردہ رسم الخط کے مطابق ہیں۔

بہرحال حضرت عثمان ؓ ''**جامع آیات القرآن**'' کی بجائے ''**جامع الاُمّۃِ علٰی رسمٍ واحدٍ**''، یعنی اُمت کو قرآن حکیم کے ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ یہ تدوین بھی حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس کے اندر مکمل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا مانتی ہے اور تمام مستشرق مانتے ہیں کہ جتنا خالص متن (pure text) قرآن کا دنیا میں موجود ہے، کسی دوسری کتاب کا موجود نہیں ہے۔ یہ بات ''**الفضل ما شھدت بہ الاعداء**'' کا مصداق ہے، یعنی فضیلت تو وہ ہے جس کو دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اور یہ کسی شے کی حقانیت کے لیے آخری ثبوت ہوتا ہے۔ پس یہ بات پوری

دنیا میں مسلّم ہے کہ قرآن حکیم کا ٹیکسٹ محفوظ ہے یا جتنا محفوظ ٹیکسٹ قرآن کا ہے اتنا اور کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یعنی قراءت کے فرق بھی ریکارڈ پر ہیں' سبعہ قراءت اور عشرہ قراءت ریکارڈ پر ہیں' ان میں بھی ایک ایک حرف کا معاملہ مدوّن ہے کہ فلاں قراءت میں یہ لفظ زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے یا زیر کے ساتھ۔ اور یہ تمام official قراءات ہیں۔ باقی جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے اس کا ٹیکسٹ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے معین کر دیا۔ امت مسلمہ پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن حکیم کی compilation اور اس کی تدوین کے متعلق یہ چیزیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ یہ حقائق سامنے نہ ہوں تو کچھ لوگ ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کر سکتے ہیں۔

قرآن مجید کا موضوع

اب ہم اگلی بحث پر آتے ہیں کہ قرآن کا موضوع کیا ہے۔ کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فزکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان —— لیکن انسان کی اناٹومی' اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں' بلکہ انسان کی ہدایت۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ﴾۔ سورۃ البقرۃ اور سورۃ النمل میں ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جبکہ سورۂ آل عمران اور سورۃ المائدۃ میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ ''هُدًى'' کا لفظ قرآن حکیم کے لیے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں' ''ال'' کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصّف:۹) هُدًى نکرہ تھا' اَلْهُدٰى معرفہ ہوگیا۔ یعنی ہدایتِ کاملہ' ہدایتِ تامّہ' ہدایتِ ابدی۔ اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ط﴾ (آیت ۱۳) گویا سورۃ الجن نے معین کیا کہ ''قُرْاٰنًا عَجَبًا'' اور ''اَلْهُدٰى'' مترادف الفاظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى﴾ (بنی اسرائیل:۹۴' الکہف:۵۵)۔ ''کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ اُن کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟'' تو گویا قرآن کا موضوع ہے ہدایت۔

اب یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان کے علم کے دو گوشے ہیں' علمِ انسانی دو حصوں میں منقسم ہے۔ (مشہور کہاوت ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَعِلْمُ الْاَدْيَانِ) ایک حصہ ہے مادی دنیا (Physical World) کا علم' مادی حقائق کا علم' جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا' چھونا ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کا کمپیوٹر اِن کو پراسیس کرتا ہے' ان سے نتائج نکالتا ہے اور انہیں سٹور کر لیتا ہے۔ پھر حواس کے ذریعہ سے مزید کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اب ان کو بھی وہ پراسیس کر کے اپنے سابقہ ''memory store'' کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کا یہ علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ابھی اور کہاں تک جائے گا۔ آج سے سو سال پہلے بھی انسان تصور نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی علم وہاں پہنچ جائے گا جہاں آج پہنچ چکا ہے۔ یہ علم بالحواس والعقل ہے اور اس علم کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس علمِ اَسماء سے ہے جو بالکل شروع میں حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا

تھا اور یہی خلافت کی بنیاد ہے۔

علم انسانی کے دو گوشوں کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع بہت اہم ہے۔ علم الا سماء کا ذکر اس کے شروع میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں کی طرف سے یہ بات استفہاماً پیش کی گئی: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ﴾ (آیت ۳۰) ''کیا آپ اس کو زمین میں خلیفہ بنائیں گے جو اِس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟'' فرشتوں کا یہ اشکال اس طرح دُور کیا گیا کہ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ''اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے''۔ یہ علمِ اسماء جو آدم کو دیا گیا' یہی خلافتِ ارضی کی بنیاد ہے۔ جو قوم اِس علم کے اندر ترقی کرے گی وہی اقتدارِ ارضی کی حق دار ٹھہرے گی۔ البتہ اس رکوع کے آخر میں فرمایا گیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی اور شیطان کے اغوا سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا بایں طور اعلان کر دیا: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۳۷) اس کے بعد ذکر ہے کہ جب آدم اور حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا کہ اب زمین میں جا کر رہو اور وہاں کا چارج سنبھالو تو فرمایا: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ ''تو جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا''۔ وہ علمِ ہدایت ہے۔

یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علمِ اَسماء درحقیقت یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت ہوتا ہے۔ وہی گٹھلی تو ہے جو آپ زمین میں دباتے ہیں۔ پھر اگر وہاں پانی پڑتا ہے اور زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی ہے تو وہ گٹھلی پھٹے گی۔ اس میں سے جو دو پتے نکلیں گے وہ پھلیں پھولیں گے' پروان چڑھیں گے تو درخت بنے گا۔ وہ پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوۃ (potentially) موجود تھا' البتہ اسے بالفعل (actually) پورا درخت بننے میں تین چار سال لگیں گے۔ تو جس طرح پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقوہ موجود تھا لیکن وہ آم کا درخت کئی سال کے اندر بالفعل وجود میں آیا' بعینہٖ یہ معاملہ کُل مادی حقائق کا ہے کہ اس ضمن میں کُل علم حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں بالقوۃ (potentially) ودیعت کر دیا گیا! اب اس کی exfoliation ہورہی ہے' وہ بڑھتا جا رہا ہے' برگ و بار لا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس علم کا کوئی تعلق آسمانی ہدایت سے نہیں ہے۔ اب یہ خودرَو پودا ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے' اور معلوم نہیں کہاں تک پہنچے گا۔ علامہ اقبال نے اس کی صحیح تعبیر کی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے!

علامہ کی زندگی میں تو انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا' لیکن اب انسان چاند پر قدم رکھ کر آ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اب تو جنیٹک انجینئرنگ اپنے کمالات دکھا رہی ہے۔ کلوننگ کے طریقے سے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی علم کے ساتھ اگر علمِ وحی یعنی علمِ ہدایت نہ ہو تو یہ علم بجائے خیر کے شر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ علم واقعتاً شیطانی قوت بن چکا ہے' ہلاکت کا سامان بن چکا ہے' تباہی کا ذریعہ بن چکا ہے۔

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى﴾ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ارتقائی مراحل طے کیے۔ جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منزلیں طے کرتی گئی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا' تا آنکہ یہ علمِ ہدایت قرآن حکیم میں آ کر ''اَلْھُـــــدٰی'' (Final Guidance) کی صورت میں مکمل ہوگیا۔ اس ہدایت میں جو ارتقاء ہوا ہے اسے بھی آپ سمجھ لیجئے۔ پہلی کتابیں جو نازل ہوئیں ان میں بھی ھُـــدًی تو تھی۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی تھی' اس میں ہدایت بھی تھی نور بھی

تھا''۔اسی رکوع میں (سورۃ المائدۃ کا ساتواں رکوع) انجیل کے بارے میں فرمایا:﴿فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۶)''اس میں بھی ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔لیکن یہ ہدایت اور نور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا ہے' یہاں تک کہ قرآن میں آ کر یہ کامل ہوا ہے اور اَلْھُدٰی بن گیا ہے۔اب یہ ھُدًی نہیں' اَلْھُدٰی ہے' یعنی ہدایتِ تامّہ۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے ایک بچے کو اگر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں دے سکتے۔آپ پرائمری میں زیرِتعلیم کسی بچے کے لیے چاہے پی ایچ ڈی استاد رکھ دیں' لیکن وہ استاد بچے کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ہی اسے تعلیم دے سکے گا۔بچہ رفتہ رفتہ آگے بڑھے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل اور شعور کی پوری شدت' قوت اور بلوغت کو پہنچ جائے گا تب اسے آخری علم پڑھایا جائے گا۔پہلے وہ تاریخ پڑھ رہا تھا' اب فلسفۂ تاریخ پڑھے گا۔اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت تدریج کے ساتھ اتاری ہے۔تورات میں صرف احکام ہیں' حکمت ہے ہی نہیں' جبکہ انجیل میں حکمت ہے' احکام ہیں ہی نہیں۔دونوں چیزیں مل کر ایک بات کو مکمل کرتی ہیں۔تورات میں صرف احکام ہیں۔جیسے آپ بچے کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' روزے کا مطلب یہ ہے کہ اب دن بھر کھانا پینا کچھ نہیں ہے۔چاہے بچہ ابھی چھ سات سال کا ہے' وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔اس طرح اسے احکام تو دے دیئے جائیں گے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ Do's ہیں یہ Donts ہیں۔

چنانچہ تورات میں احکامِ عشرہ (The Ten Commandments) دے دیئے گئے' لیکن ابھی ان کی حکمت نہیں بتائی گئی۔اس لیے کہ ابھی حکمت کا تحمل انسان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ابھی نوعِ انسانی کا عہدِ طفولیت تھا۔یوں سمجھئے کہ وہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل کا انسان تھا۔تورات چودہ سو قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔اس کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی' جس میں صرف حکمت ہے' احکام ہیں ہی نہیں۔لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں (اب بھی موجود ہیں) کہ آپؑ نے اپنے حواریّین سے فرمایا تھا:''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی تھیں' مگر ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے' جب وہ فارقلیطؐ آئے گا تو تمہیں سب کچھ بتائے گا''۔یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی۔حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ ابھی تم تحمل نہیں کر سکتے۔گویا تمہاری ذہنی بلوغت کے لیے چھ سو برس مزید درکار ہیں۔چنانچہ الہدیٰ قرآن حکیم میں آ کر مکمل ہوا ہے۔

قرآن مجید جو ہدایت دیتا ہے اس کے بھی دو حصے ہیں۔ایک فکر و نظر کی ہدایت ہے' جس کا عنوان ''ایمان'' ہے۔اس کا موضوع وہی ہے جو فلسفے کا ہے۔یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے' زندگی کی حقیقت کیا ہے' زندگی کا مآل کیا ہے' اس کا آغاز کیا ہے' انجام کیا ہے' صحیح کیا ہے' غلط کیا ہے' خیر کیا ہے' شر کیا ہے' علم کیا ہے؟ قرآن مجید کا دوسرا موضوع ہدایتِ عملی ہے' انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔یہ اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام پر مشتمل ہے۔پھر اس میں معاشی و معاشرتی احکام بھی ہیں۔یہ ہدایتِ فکر و نظر اور ہدایتِ فعل و عمل (انفرادی و اجتماعی) قرآن حکیم کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے' قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے' سائنس کی کتاب نہیں ہے' البتہ اس میں سائنسی علوم کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان کے حوالے موجود ہیں۔قرآن مجید کائناتی حقائق کو آیاتِ الٰہیہ قرار دیتا ہے۔سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ملاحظہ کیجئے' جسے میں آیت الآیات قرار دیتا ہوں:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ

وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں' اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ان میں اللہ کی قدرت' اللہ کی عظمت' اللہ کا علمِ کامل' اللہ کی حکمتِ بالغہ سب کچھ شامل ہے۔تو یہ جو مظاہر طبیعی (Physical phenomena) ہیں' قرآن حکیم ان کا جابجا حوالہ دیتا ہے۔بعض کائناتی حقائق وہ ہیں جن کا تعلق فلکیات (astronomy) سے ہے۔فرمایا: ﴿وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ یعنی یہ تمام اجرامِ سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔معلوم ہوا ہر شے حرکت میں ہے۔انسان پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔پھر ایک دَور آیا جس میں کہا گیا کہ نہیں' سورج ساکن ہے' زمین حرکت کرتی ہے' زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے' اور آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔سورج کا بھی اپنا ایک مدار ہے' اس میں وہ اپنے پورے کنبے سمیت حرکت کر رہا ہے۔یہ نظامِ شمسی اس کا کنبہ ہے' اس پورے کنبے کو لے کر وہ بھی ایک مدار میں حرکت کر رہا ہے۔تو معلوم ہوا کہ الفاظِ قرآنی: ﴿کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴿۴۰﴾﴾ میں ''کُلٌّ'' کا لفظ جس طرح منطبق اور مبرہن ہوکر' جس شان کے ساتھ آج ہویدا ہوا ہے' آج سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھا۔قرآن مجید میں کائناتی مظاہر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔یہ وہ حقیقت ہے جو اِس دَور میں آ کر پوری طرح واضح ہوئی ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی ایک فرانسیسی سرجن تھے۔انہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔واضح رہے کہ بائبل سے مراد عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) دونوں ہیں۔تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہمارے سائنسی انکشافات میں سے کسی نے غلط ثابت کیا ہو' جب کہ تورات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ سائنس انہیں غلط ثابت کر چکی ہے۔اس پر انہوں نے ۲۵۰ صفحات کی کتاب تحریر کی: ''The Bible, The Quran and Science''۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات بھی تو اللہ کی کتاب ہے' پھر اس میں ایسی چیزیں کیوں آ گئیں جو سائنسی حقائق کے خلاف ہیں۔اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہوگئی تھی جب بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی ہوئی تھی۔اس کے ڈیڑھ سو برس بعد کچھ لوگوں نے تورات کو یادداشتوں سے مرتب کیا۔لہٰذا اُس وقت انسانی علم کی جو سطح تھی اس کے اعتبارات سے تاویلات تورات میں شامل ہوگئیں' کیونکہ انسان تو اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے۔تورات میں تحریف ہونے کی وجہ سے اِس میں ایسی چیزیں درآئیں جو سائنس کی رو سے غلط ثابت ہوئیں۔البتہ قرآن میں ایسی کوئی تاویل نہیں ہوئی اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔یہ بات بڑی اہم ہے۔اس کو بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کہا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا فعل ہے۔اس کی تخلیق اور اس کی تدبیر ہے' جبکہ قرآن اللہ کا قول ہے' اور اللہ تعالیٰ کے قول و عمل میں تضاد ممکن نہیں ہے۔کسی انسان کے قول و عمل میں بھی اگر کوئی تضاد ہو تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے اتر جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے قول اور عمل میں تضاد کیسے ہوسکتا ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دَور میں انسانوں نے بات سمجھی نہ ہو' اُن کا ذہن وہاں تک پہنچا نہ ہو' ان کی معلومات کا دائرہ ابھی اس حد تک ہو کہ ان حقائق تک نہ پہنچا جا سکے۔لیکن جیسے جیسے وقت آئے گا مزید حقائق منکشف ہوں گے اور یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے

فرمایا ہے وہی برحق ہے۔ ہاں آج سے پہلے انسانی ذہن اِس حد تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔ سورۃ حم السجدۃ کی آخری سے پہلی آیت ذہن میں رکھیے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾

''ہم انہیں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کی جانوں میں بھی' یہاں تک کہ یہ بات پوری طرح نکھر کر اُن کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن ہی حق ہے''۔

ڈاکٹر کیتھ این مُور کینیڈا کے بہت بڑے ایمبر یالوجسٹ ہیں۔ ان کی کتاب علمِ جنین (Embriology) میں سند مانی جاتی ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بطور ٹیکسٹ بک پڑھائی جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آج سے چودہ سو برس قبل جبکہ نہ مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی dissection ہوتا تھا' قرآن نے علمِ جنین کے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کا مطالعہ کرتے ہوئے انگشت بدنداں ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ﴾

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا''۔

ان کا کہنا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر ممکن نہیں ہے۔ تو یہ حقیقت ذہن میں رکھئے کہ اگرچہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے' لیکن جن سائنسی حقائق یا سائنسی مظاہر (phenomena) کا قرآن نے حوالہ دیا ہے وہ یقیناً حق ہیں' چاہے تا حال ہم ان کی حقانیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔ مثلاً آج بھی مجھے نہیں معلوم کہ قرآن جو ''سات آسمان'' کہتا ہے تو اِن سے کیا مراد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان سمجھے گا کہ ''سات آسمان'' کے یہ الفاظ ٹھیک ٹھیک اس حقیقت پر منطبق ہوتے ہیں جو آج ہمارے علم میں آئی ہے' پہلے نہیں آئی تھی۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عملی اعتبار سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن سائنس یا ٹیکنالوجی کی کتاب نہیں ہے اور اس حوالے سے ایک بڑا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہمارے اسلاف نے اپنے دَور کی معلومات کی سطح پر قرآن کی ان آیات کا کوئی خاص مفہوم معین کیا تو ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم قرآن میں بیان کردہ سائنسی مظاہر کو اس سائنسی ترقی کے حوالے سے سمجھیں گے جو روز بروز ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ آخری بات عرض کر رہا ہوں کہ اس معاملے میں خود محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اگر کوئی بات منقول ہو تو وہ بھی قطعی نہیں سمجھی جائے گی' کیونکہ حضور ﷺ یہ چیزیں سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ یہ بات اگرچہ بہت سے لوگوں پر ثقیل اور گراں گزرے گی لیکن صحیح طرزِ عمل یہی ہوگا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں اگر حضور ﷺ کی کوئی حدیث بھی سامنے آ جائے تو اس کو بھی ہم دلیلِ قطعی نہیں سمجھیں گے۔

اس سلسلے میں تأ بیر نخل کا واقعہ بہت اہم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پیدائش مکہ کی ہے' ہجرت تک ساری زندگی آپ نے وہاں گزاری' وہ وادئ غیر ذی زرع ہے' جہاں کوئی پیداوار' کوئی زراعت' کوئی کاشت ہوتی ہی نہیں تھی' لہٰذا آپؐ کو اس کا کوئی تجربہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ ہاں تجارت کا بھرپور تجربہ تھا اور اس کے تمام اَسرار و رموز سے آپؐ واقف تھے۔ آپؐ مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ کھجوروں کے سلسلہ میں انصارِ مدینہ ''تأ بیر نخل'' کا معاملہ کرتے تھے۔ کھجور ایک ایسا پودا ہے جس کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگر اس کے نر اور مادہ پھولوں کو قریب

لے آئیں تو اس کے بار آور ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اہل مدینہ کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔ مدینہ تشریف آوری پر رسول اللہ ﷺ نے جب اہل مدینہ کا یہ معمول دیکھا تو اُن سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ایسا نہ کریں تو کیا ہے؟ ایسا نہ کرنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔ یہ بات آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق اس بنیاد پر فرمائی کہ فطرت اپنی دیکھ بھال خود کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کا نظام انسانوں پر نہیں چھوڑا' بلکہ یہ تو خودکار نظام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اس قدرتی نظام میں دخل نہ دیں تو کیا ہے؟ البتہ آپؐ نے روکا نہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے حضور ﷺ کا اتنا کہنا بھی گویا حکم کے درجہ میں تھا۔ انہوں نے اس سال وہ کام نہیں کیا' لیکن فصل کم ہو گئی۔ اب وہ ڈرتے ڈرتے' جھجکتے جھجکتے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم نے اس مرتبہ تأ بیر نخل نہیں کی تو فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) اس حدیث کا ایک ایک لفظ یاد کر لیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے اپنے دُنیوی اور مادی معاملات ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہے' یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تم زیادہ تجربہ کار ہو' تم ان حقائق سے زیادہ واقف ہو۔ ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ ' اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ ' وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيِىْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ)) ''میں تو ایک بشر ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس سے سرتابی نہ کرنا' لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو جان لو کہ میں ایک بشر ہی ہوں''۔ (یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم کی ہیں۔ کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ما قاله ﷺ شرعاً دون ما ذكره من معايش الدنيا على سبيل الرأى) گویا آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ میں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا' میں جو کچھ سکھانے آیا ہوں وہ مجھ سے لو!

اس اعتبار سے یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے آپؐ ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ آپؐ طب و جراحت سکھانے نہیں آئے تھے' آپؐ کوئی اور سائنس پڑھانے نہیں آئے تھے۔ ورنہ تو ہم شکوہ کرتے کہ آپؐ نے ہمیں ایٹم بم بنانا کیوں نہیں سکھا دیا؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) تو ہمارے لیے یہ بات آخری درجے میں سند ہے کہ جیسے جیسے سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں' جیسے جیسے علم انسانی کی exploration ہو رہی ہے' ویسے ویسے حقائق فطرت ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہو رہے ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم کا پورا درخت وجود میں آتا ہے ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں علم بالحواس اور علم بالعقل کا جو mechanism رکھ دیا گیا تھا' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علم پھیل رہا ہے۔ اس سے جو بھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان میں کہیں رکاوٹ نہیں ہے کہ ہم سلف کی بات کو لے کر بیٹھ جائیں کہ سائنس خواہ کچھ بھی کہے ہم تو اسلاف کی بات مانیں گے۔ یہاں پر اس طرزِ عمل کے لیے کوئی دلیل اور بنیاد نہیں۔

قرآن کا اصل موضوع ایمان ہے۔ ماوراء الطبیعیاتی حقائق عالم غیب سے متعلق ہیں' جو ہمارے عالمِ محسوسات سے ماوراء ہیں' جس کی خبریں ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہیں۔ علم حقیقت جسے ہم اجمالی طور پر ایمان کہتے ہیں یہ قرآن کا اصل موضوع ہے' یعنی ہدایتِ فکری و عملی۔ تمدنی میدان میں' معاشی و اقتصادی اور معاشرتی میدان میں یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ چیزیں کھانے پینے کی ہیں' یہ چیزیں کھانے پینے کی نہیں ہیں۔ یہ حرام ہیں' یہ نجس ہیں۔ یہ علم حضور ﷺ نے دیا ہے اور قرآن کا موضوع اصل میں یہی ہے۔ البتہ قرآن میں جو سائنسی ریفرنسز آئے ہیں' وہ غلط نہیں ہیں' وہ لازماً درست ہیں۔

انسانی علم کے تین دائرے ہیں۔ ایک علم بالحواس ہے' یہ انسانی علم کا پہلا دائرہ ہے۔ حواس کے ذریعے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں' جنہیں آج کل ہم sense data کہتے ہیں۔ آنکھ نے دیکھا' کان نے سنا' ہاتھ نے اس کی پیمائش کی۔ اس کے بعد دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ عقل sense data کو پراسیس کرتی ہے۔ اس ضمن میں استدلال اور استنباط کے اصول معین کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے' پھر عقل ان معلومات کو process کرتی ہے تو انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یوں عقل حواس کی محتاج ہوئی' لیکن عقل و حواس کے ماورا بھی ایک علم ہے جسے

شاہ اسماعیل شہیدؒ نے علم بالقلب کا نام دیا ہے۔ آج اسے extra sensory perceptions کہا جا رہا ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس کے لیے وجدان (intuition) کا لفظ تھا۔ یہ علم بالقلب درحقیقت وہ خاص انسانی علم ہے جس سے آج کے مادہ پرست واقف نہیں ہیں۔ وحی کا تعلق اسی تیسرے دائرے سے ہے۔ اس لیے کہ وحی کا نزول قلب پر ہوتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿١٩٣﴾ عَلٰى قَلْبِكَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿١٩٤﴾﴾ (الشعراء)

عقل اور حواس سے حاصل ہونے والے علوم میں تمام فزیکل سائنسز‘ میڈیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل ہیں۔ انسان نے مختلف چیزوں کے خواص معلوم کیے‘ کچھ طبعی اور کیمیائی تبدیلیوں کے اصول دریافت کیے۔ پھر ان اصولوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کو استعمال کیا۔ اس سے انسان کی ٹیکنالوجی ترقی کرتی جا رہی ہے اور ابھی نامعلوم کہاں تک پہنچے گی۔ یہ ایک علم ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا﴾ کے الفاظ میں کر دیا گیا۔ البتہ انسان صرف اس علم پر قانع نہیں رہا‘ اس لیے کہ اس سے تو صرف جزوی علم حاصل ہوتا ہے‘ انسان ایک ایک جزو قدم بقدم سیکھتا ہے۔ انسان کی ایک طلب (urge) ہے کہ وہ ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ علم کی حقیقت‘ خیر وشر کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کے انسان کی معلومات (علم بالحواس اور علم بالعقل کے اعتبار سے) بڑی محدود تھیں‘ لیکن اُس وقت کے انسان کو بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی رائے قائم کرے کہ یہ کائنات جس کا میں ایک فرد ہوں‘ اس کی حقیقت کیا ہے‘ خود میری حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کا آغاز کیا ہے؟ میرا اس کے ساتھ ربط وتعلق کیا ہے؟ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ میں اپنی زندگی میں کیا کروں‘ کیا نہ کروں؟ کیا کرنا صحیح ہے کیا کرنا غلط ہے؟ یہ انسان کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس ضرورت کے تحت جب انسان نے سوچنا شروع کیا تو فلسفہ کا آغاز ہوا جو گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے پھر انسان نے عقل کے گھوڑے دوڑائے‘ اپنی منطق کو استعمال کیا۔ فلسفہ‘ مابعد الطبیعیات‘ الٰہیات‘ اخلاقیات اور نفسیات‘ یہ تمام علوم انسانی علوم میں سے ہیں۔ گویا کہ علم بالحواس اور علم بالعقل کے نتیجے میں یہ دو علم وجود میں آئے۔ ایک فزیکل سائنسز کا علم جس کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے‘ دوسرا سوشل سائنسز کا علم جس میں فلاسفی‘ سوشیالوجی‘ نفسیات‘ اخلاقیات‘ اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

جان لیجیے کہ ھُدًی جس کی تکمیلی شکل ”الھُدٰی“ قرآن مجید ہے‘ اس کا موضوع انسانی علم کا دائرۂ اوّل نہیں ہے۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے یا ٹیکنالوجی سکھانے آئی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر کی طرف حوالے موجود ہیں اور وہ لازماً درست ہیں‘ لیکن وہ قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسان کے سائنسی علم میں تدریجاً ترقی ہو رہی ہے اسی طرح ان ریفرنسز کو سمجھنا بھی انسان کے لیے ممکن ہو رہا ہے۔ البتہ قرآن کا اصل موضوع مابعد الطبیعیات ہے۔ پھر فکر وعمل دونوں کے لیے راہنمائی درکار ہے‘ جیسے کہ کسی راستے پر چلنے والے کو ”روڈ سائنز“ کی ضرورت ہوتی ہے کہ اِدھر نہ جانا‘ اِدھر خطرہ ہے‘ ہلاکت ہے۔ اسی طرح انسان کو سفرِ حیات میں ان cautions کی ضرورت ہے کہ ادھر خطرہ ہے‘ یہ تمہارے لیے ممنوع ہے‘ یہ حرام ہے‘ یہ نقصان دہ ہے‘ اس میں ہلاکت ہے‘ چاہے تمہیں ہلاکت نظر نہیں آ رہی لیکن تم ادھر جاؤ گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کا اصل موضوع ہے۔

فہمِ قرآن کے اصول

فہم قرآن کے سلسلہ میں درج ذیل عنوانات کی تفہیم ضروری ہے۔

۱) قرآن کریم کا اسلوبِ استدلال

قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں' فطری ہے۔ انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطق ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور متکلمین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں' جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے متکلمین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ منطق' منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوبِ استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارومدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیش نظر ان حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ ع

"اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!"

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے تو اس کے اندر صرف عقل ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہے نورِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یہ جو اِس کے اندر "کوئی اور" شے بھی ہے' اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جھانکے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! چاہے اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرزِ استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کرو' سوچو' اپنے اندر جھانکو۔ جیسے سورۃ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ "کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟" یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے' لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جھانکو' تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا' تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی ط﴾ "کیا تم واقعی اس بات کی

گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟'' یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو' لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جھانکو' کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اِس کے مدعی تھے اور اپنے معبودانِ باطل کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے' تمہارے باپ دادا کی روایت ہے' اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں ہے' بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔

۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم

سورۃ آل عمران کی آیت ۷ ملاحظہ کیجیے! ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ط﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے (اے محمد ﷺ) آپ پر کتاب نازل کی' اس میں سے کچھ آیات محکمات ہیں' وہی کتاب کی جڑ بنیاد ہیں اور دوسری متشابہ ہیں''۔ اس آیت میں لفظ کتاب دو دفعہ آیا ہے' دونوں کے مفہوم میں باریک سا فرق ہے۔ متشابہ ان معانی میں کہ ان کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے' وہ آیاتِ متشابہات ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ج﴾ ''تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں (ان ہی پر غور و فکر اور ان ہی میں کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں) اُن کی نیت ہی فتنہ اٹھانے کی ہے' اور وہ بھی ہیں جو اُس کا اصل مفہوم جاننا چاہتے ہیں''۔ ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''حالانکہ اس کے حقیقی معانی و مراد اللہ ہی جانتا ہے''۔ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ج﴾ ''البتہ جو لوگ علم میں پختگی کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس پوری کتاب پر (محکمات پر بھی اور متشابہات پر بھی)' یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے''۔ ﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٧﴾﴾ ''لیکن نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں''۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان عقلمندوں اور ہوش مندوں میں شامل کرے' رَاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ میں ہمارا شمار ہو!

محکم اور متشابہ سے مراد کیا ہے؟ جان لیجیے کہ ''محکم قطعی'' یعنی وہ محکم جن کے قطعی ہونے میں نہ پہلے کوئی شبہ ہو سکتا تھا نہ اَب ہے' نہ آئندہ ہو گا' وہ تو قرآن حکیم کے اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ جائز ہے' یہ ناجائز ہے' یہ پسندیدہ ہے' یہ ناپسندیدہ ہے' یہ اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کو ناپسند ہے!

قرآن حکیم کا عملی حصہ درحقیقت محکمات ہی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں کتاب کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے لیے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ قرآن مجید کا جو حصہ عملی ہدایات پر مشتمل ہے اس کے لیے بھی لفظ ''کتاب'' مخصوص ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ جو لفظ کتاب آیا ہے ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ وہ اسی مفہوم میں ہے۔ جہاں کوئی شے واجب کی جاتی ہے وہاں ''كُتِبَ'' کا لفظ آتا ہے۔ جیسے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ...... كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ...... كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ نماز کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ یہاں کتاب سے مراد وہ حکم ہے جو دیا گیا ہے' تو اِن معانی میں ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد قانون' شریعت' عملی ہدایات' اوامر و نواہی ہیں اور اصل میں وہی محکمات ہیں۔

دائمی متشابہات عالَمِ غیب اور اس کے ضمن میں عالمِ برزخ' عالمِ آخرت' عالمِ ارواح' ملائکہ کا عالَم اور عالمِ امثال وغیرہ ہیں۔ یہ درحقیقت وہ

دائرہ ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس کی حقیقتوں کو کما حقہٗ اس زندگی میں سمجھنا محال اور ناممکن ہے۔ لیکن ان کا ایک علم دیا جانا ضروری تھا۔ مابعدالطبیعیات ایمانیات کے لیے ضروری ہے کہ اس سب کا ایک اجمالی خاکہ سامنے ہو۔ ہر انسان نے مرنا ہے‘ مرنے کے فوراً بعد عالمِ برزخ میں یہ کچھ ہونا ہے‘ بعث بعد الموت ہے‘ حشر نشر ہے‘ حساب کتاب ہے‘ جنت و دوزخ ہے۔ ان حقیقتوں کا اجمالی علم موجود نہ ہو تو بنیادی ضرورت کے طور پر انسان کو جو فلسفہ درکار ہے وہ تو اس کو فراہم نہیں ہوگا۔ لیکن اِن حقیقتوں تک رسائی اس زندگی میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں‘ لہٰذا ان کا جو علم دیا گیا ہے وہ آیاتِ متشابہات ہیں‘ اور وہ دائماً متشابہات ہی رہیں گی۔ ہاں جب اُس عالم میں آنکھ کھلے گی تو اصل حقیقت معلوم ہوگی‘ یہاں معلوم نہیں ہوسکتی۔

البتہ متشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً متشابہات سے محکمات کی طرف آ رہا ہے۔ وہ دائرہ مظاہر طبیعی (physical phenomena) سے متعلق ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا‘ آج یہ کچھ محدود ہوا ہے‘ لیکن اب بھی بہت سے حقائق ہم نہیں جانتے۔ سات آسمانوں کی حقیقت آج تک ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ آگے چل کر ہمارا میٹیریل سائنسز کا علم اس حد تک پہنچ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے سات آسمانوں سے متعلق کہی تھی‘ لیکن اِس وقت یہ ہمارے لیے متشابہات میں سے ہے۔ اسی طرح ایک آیت ﴿كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾(یٰسٓ) (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) اس کو پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا‘ لیکن آج یہ حقیقت محکم ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ ع

''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!''

اگر آپ نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر چیز حرکت میں ہے۔ کہکشاں کو دیکھیں تو ہر شے حرکت میں ہے۔ کہکشائیں ایک دوسرے سے دُور بھاگ رہی ہیں‘ فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ذرے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔ گویا ہر شے حرکت میں ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل یہ بات متشابہات میں تھی‘ آج وہ محکمات کے دائرے میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے وہ سائنسی حقائق جو ابھی تک انسان کو معلوم نہیں ہیں اور ان کے حوالے قرآن میں ہیں‘ وہ آج کے اعتبار سے تو متشابہات میں شمار ہوں گے لیکن انسان کا فزیکل سائنسز کا علم آگے بڑھے گا تو وہ تدریجاً متشابہات کے دائرے سے نکل کر محکمات کے دائرے میں آ جائیں گے۔

۳) تفسیر اور تاویل کا فرق

تفسیر اور تاویل دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ''۔ تفسیر کا لفظ قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَلَا یَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا ۝۳۳﴾ ''اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بہترین طریقے سے بات کھول دیتے ہیں''۔ یہ لفظ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے‘ جبکہ تاویل کا لفظ سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔ اس کے کچھ اور مفاہیم بھی ہیں اور قرآن کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ تفسیر اور تاویل میں فرق کیا ہے؟ تفسیر کا مادہ ''ف‘ س‘ ر'' ہے۔ یہ گویا ''سفر'' کی منقلب شکل ہے۔ سفر بمعنی Journey بھی ہے —— اور اس کا مطلب روشنی بھی ہے‘ کتاب بھی ہے۔ حروف ذرا آگے پیچھے ہو گئے ہیں‘ لفظ ایک ہی ہے۔ تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا‘ واضح کر دینا‘ کسی شے کو روشن کر دینا‘ لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے‘ جبکہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے مراد کیا ہے‘ اس سے اصل مقصود کیا ہے‘ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ لہٰذا زیادہ تر یہی لفظ قرآن کے لیے مستعمل ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں اردو دان لوگ زیادہ تر لفظ تفسیر استعمال کرتے ہیں کہ فلاں آیت کی تفسیر‘ فلاں لفظ کی تفسیر‘ لیکن اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح

تاویل ہی ہے اور حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا منقول ہے: ((اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ)) یعنی اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما! چنانچہ کلام کی اصل حقیقت، اصل مراد، اصل مطلوب، اصل مدلول کو پالینا تاکہ انسان اصل مقصود تک پہنچ جائے، اسے تاویل کہتے ہیں۔ ع

''جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!''

ا،و،ل کا مادہ عربی زبان میں کسی شے کی طرف لوٹنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہم فلاں کی آل ہیں، یعنی وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ ''آلِ فرعون'' کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں ہے، بلکہ ''فرعون والے، فرعونی'' ہے۔ وہ فرعون ہی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کو اپنا معبود یعنی حاکم اور پیشوا سمجھتے تھے۔ اسی معنی میں کسی عبارت کو اُس کے اصل مفہوم کی طرف لوٹانا تاویل ہے۔ تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۴) تاویلِ عام اور تاویلِ خاص

قرآن حکیم کی کسی ایک آیت یا چند آیات کے مجموعے یا کسی خاص مضمون جو چند آیات میں مکمل ہو رہا ہے، پر غور کرنے میں دو مرحلے ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں: ایک تاویل خاص، دوسرے تاویل عام۔ اس سلسلہ میں یاد رہے کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں نازل ہوا ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے عرصے پر محیط ہے اور اس کے نزول کی جگہ سرزمین حجاز ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اُس وقت اور اُس علاقے کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو اُمّی تھے، پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر انہیں فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا جاتا، سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ قرآنی آیات تو ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئیں، کیونکہ براہِ راست ابلاغ تھا، کوئی barrier موجود نہیں تھا۔ تو قرآن حکیم کا یہ شانِ نزول ذہن میں رکھیے۔ ویسے تو ''شانِ نزول'' کی اصطلاح کسی خاص آیت کے لیے استعمال ہوتی ہے، لیکن ایک خاص time and space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے جس میں یہ نازل ہوا۔ وہاں کے حالات، اس عرصے کے واقعات، ان حالات میں تدریجاً جو تبدیلی ہوئی، پھر کون لوگ اس کے مخاطب تھے، مکّے والوں کے عقائد، ان کی رسمیں ریتیں، ان کے نظریات، ان کے مسلّمات، ان کی دلچسپیاں...... جب قرآن کو اس سیاق و سباق (context) میں رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویل خاص ہوگی۔ اسی میں آپ مزید تفصیل میں جائیں گے کہ فلاں آیت کا واقعاتی پس منظر کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی کسی آیت یا چند آیات پر غور کرتے ہوئے اوّلاً اس کو اس کے context میں رکھ کر غور کرنا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت لوگوں نے ان کا مفہوم کیا سمجھا، یہ تاویل خاص ہوگی۔ البتہ قرآن مجید چونکہ نوعِ انسانی کی ابدی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، صرف خاص فلاں علاقے اور خاص زمانے کے لوگوں کے لیے تو نازل نہیں ہوا، لہٰذا اس میں ابدی ہدایت ہے، اس اعتبار سے تاویل عام کرنا ہوگی۔

تاویل عام کے اعتبار سے الفاظ پر غور کریں گے کہ الفاظ کیا استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ جب ترکیبوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کیا ترکیبیں بنتی ہیں۔ پھر آیات کا باہمی ربط کیا ہے، سیاق و سباق کیا ہے؟ یہ آیات جس سورۃ میں آئیں اس کا عمود کیا ہے، اس سورۃ کا جوڑا کون سا ہے، یہ سورۃ کس سلسلۂ سُوَر کا حصہ ہے۔ پھر وہ سورتیں مکّی اور مدنی کون سے گروپ میں شامل ہیں، ان کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ اس پس منظر میں ایک سیاق و سباق متن (text) کا ہوگا، جس سے ہمیں تاویلِ عام معلوم ہوگی اور ایک سیاق و سباق واقعات کا ہوگا، جس سے ہمیں ان آیات کی تاویلِ خاص معلوم ہوگی۔

اگر ہم قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس ترتیب سے اِس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حجت

یہی ہے‘ یہی اصل ترتیب ہے‘ یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ تاویل عام کے اعتبار سے ایک اصولی بات یاد رکھیں: **الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب**۔ یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شانِ نزول کا۔ دیکھا جائے گا کہ جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مفہوم و معنیٰ‘ نیز مدلول کیا ہے۔ کلامِ عرب سے دلائل لائے جائیں گے کہ وہ انہیں کن معانی میں استعمال کرتے تھے۔ اُس لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ اُس کے شانِ نزول کا۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اسے بالکل نظرانداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہوگی کہ پہلے اس کی تاویل خاص پر غور کریں اور پھر اس کے ابدی سرچشمۂ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویل خاص اور تاویل عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔

۵) تذکر و تدبر

تذکر اور تدبر دونوں الفاظ الگ الگ تو بہت جگہ آئے ہیں‘ سورۃ صٓ کی آیت ۲۹ میں یکجا آ گئے ہیں: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۲۹﴾ ’’یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبیؐ) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں‘‘۔ ان دونوں کا مطلب کیا ہے؟ ایک ہے قرآن مجید سے ہدایت اخذ کر لینا‘ نصیحت حاصل کر لینا‘ اصل حاصل کو لینا‘ جس کو کہ مولانا روم نے کہا ع ’’ما ز قرآں مغز ہا برداشتیم‘‘ یعنی قرآن کا جو اصل مغز ہے وہ تو ہم نے لے لیا۔ اس کا اصل مغز ’’ہدایت‘‘ ہے۔ اس مرحلے پر قرآن جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ’’تذکر‘‘ ہے۔ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے۔ تذکر یاد دہانی کو کہتے ہیں۔ اب اس کا تعلق اسی بات سے جڑ جائے گا جو قرآن کے اسلوبِ استدلال کے ضمن میں پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن مجید جن اصل حقائق (مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں) کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی میں مضمر ہیں‘ ان پر صرف ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی بات کچھ عرصہ قبل معلوم تھی‘ لیکن اب اس کی طرف دھیان نہیں رہا اور وہ آپ کی یادداشت کے ذخیرے میں گہری اتر گئی ہے اور اب یاد نہیں آتی‘ لیکن کسی روز اُس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ ملتے ہی آپ کو وہ پوری بات یاد آ جاتی ہے۔ جیسے آپ کا کوئی دوست تھا‘ کسی زمانے میں بے تکلفی تھی‘ صبح شام ملاقاتیں تھیں‘ اب طویل عرصہ ہو گیا‘ کبھی اس کی یاد نہیں آئی۔ ایسا نہیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا‘ بلکہ ذہول ہے‘ نسیان ہے‘ توجہ اُدھر نہیں ہے‘ کبھی ذہن اُدھر منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک کسی روز آپ نے اپنا ٹرنک کھولا اور اس میں سے کوئی قلم یا رومال جو اُس نے کبھی دیا ہو برآمد ہو گیا تو فوراً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جائے گا۔ یہ phenomenon تذکر ہے۔ تذکر کا مطلب تعلّم نہیں ہے۔ تعلّم علم حاصل کرنا یعنی نئی بات جاننا ہے‘ جبکہ تذکر پہلے سے حاصل شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے جو پردے پڑ گئے تھے‘ ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ کی محبت‘ اللہ کی معرفت کے حقائق مضمر ہیں۔ یہ فطرت میں موجود ہیں‘ صرف اُن پر پردے پڑ گئے ہیں‘ دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے۔ ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! (فیضؔ)

یہاں کی دلچسپیوں‘ مسائل‘ مشکلات‘ مصروفیات‘ مشاغل کی وجہ سے ذہول ہو گیا ہے‘ پردہ پڑ گیا ہے۔ تذکر یہ ہے کہ اس پردے کو ہٹا دیا جائے۔ ع

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں‘ لوحِ جبیں تازہ کریں! (حفیظؔ)

یادداشت کو recall کرنا اور اپنی فطرت میں مضمر حقائق کو اجاگر کر لینا تذکر ہے۔ قرآن کا اصل ہدف یہی ہے اور اس اعتبار سے قرآن کا دعویٰ سورۃ القمر میں چار مرتبہ آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ’’ہم نے قرآن کو تذکر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے‘ تو کوئی ہے

نصیحت حاصل کرنے والا؟'' اس کے لیے بہت گہرائی میں غوطہ زنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بہت مشقت و محنت مطلوب نہیں ہے۔ انسان کے اندر طلبِ حقیقت ہو اور قرآن سے براہِ راست رابطہ (Communication) ہو جائے تو تذکر حاصل ہو جائے گا۔ اس کی شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ وہ قرآن سے ہم کلام ہو جائے۔ اگر آپ ترجمہ دیکھیں گے تو کچھ معلومات تو حاصل ہوں گی' تذکر نہیں ہوگا۔ اقبال نے کہا تھا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

تذکر کے عمل کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کے اندر کے مضمر حقائق ابھر کر آپ کے شعور کی سطح پر دوبارہ آ جائیں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے آپ نے متن کو پڑھا' پھر ترجمہ دیکھا' حاشیہ دیکھا' اس کے بعد اگلی آیت کی طرف گئے تو تسلسل ٹوٹ گیا اور کلام کی تاثیر ختم ہو گئی۔ ترجمہ سے کلام کی اصل تاثیر باقی نہیں رہتی۔ شیکسپیئر کی کوئی عبارت آپ انگریزی میں پڑھیں گے تو جھوم جائیں گے' اگر اس کا ترجمہ کریں گے تو اس کا وہ اثر نہیں ہوگا۔ اسی طرح غالبؔ کا شعر ہو یا میرؔ کا' اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے تو وہ اثر باقی نہیں رہے گا اور آپ وجد میں نہیں آئیں گے' جھوم جھوم نہیں جائیں گے۔ عربی زبان کا اتنا علم کہ آپ عربی متن کو براہ راست سمجھ سکیں' تذکر کی بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ اوّلاً حسنِ نیت ہو' طلبِ ہدایت ہو' تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو' اور ثانیاً عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ آپ براہِ راست اس سے ہم کلام ہو رہے ہوں' یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو تذکر ہو جائے گا۔

دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ آیت کا مطلب نشانی ہے۔ نشانی اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ کر ذہن کسی اور شے کی طرف منتقل ہو جائے۔ آپ نے قلم یا رومال دیکھا تو ذہن دوست کی طرف منتقل ہو گیا جس سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟

ہمارا ایک ازلی دوست ہے ''اللہ''، وہی ہمارا خالق ہے' ہمارا باری ہے' ہمارا ربّ ہے۔ اس کی دوستی پر کچھ پردے پڑ گئے ہیں' اس پر کچھ ذہول طاری ہو گیا ہے۔ قرآن اس دوست کی یاد دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس کے برعکس تدبر گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں۔ ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' تدبر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ اس کا منبع اور سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی لامتناہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کلام میں متکلم کی ساری صفات موجود ہوتی ہیں' لہٰذا یہ کلام لامتناہی ہے۔ اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے' چاہے پوری پوری زندگیاں کھپا لیں۔ وہ چاہے صاحبِ کشاف ہوں' صاحبِ تفسیر کبیر ہوں' کسے باشد۔ اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ بعض لوگ غیر محتاط انداز میں یہ الفاظ استعمال کر دیتے ہیں کہ ''انہیں قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے۔'' یہ قرآن کے لیے بڑا توہین آمیز کلمہ ہے۔ عبور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا تو کنارہ ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن پر عبور حاصل کرے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح اس کی گہرائی تک پہنچ جانا بھی ناممکن ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تمثیل سے بات کسی قدر واضح ہو جائے گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی ٹینکر تیل لے کر جا رہا ہے اور کسی وجہ سے اچانک تیل لیک کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن وہ تیل سطح سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے' نیچے نہیں جاتا۔ سطح سمندر پر اوپر تیل کی تہہ اور نیچے پانی ہوتا ہے اور وہ تیل پانچ دس میل تک پھیل جاتا ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائی کے باوجود تیل سطحِ آب پر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید کی اصل ہدایت اور اصل

تذکر اس کی سطح پر موجود ہے۔ اس تک رسائی کے لیے سائنس دان یا فلسفی ہونا‘ عربی ادب کا ماہر ہونا‘ کلامِ جاہلی کا عالم ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو چیزیں موجود ہوں۔ پہلی خلوصِ نیت اور طلب ہدایت‘ دوسری قرآن سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف اور اس کی صلاحیت۔ یہ دونوں ہیں تو تذکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ البتہ تدبر کے لیے گہرائی میں اترنا ہوگا اور اس بحرِ زخّار میں غوطہ زنی کرنا ہوگی۔ تدبر کا حق ادا کرنے کے لیے شعرِ جاہلی کو بھی جاننا ضروری ہے۔ ہر لفظ کی پہچان ضروری ہے کہ جس دور میں قرآن نازل ہوا اُس زمانے اور اُس علاقے کے لوگوں میں اس لفظ کا مفہوم کیا تھا‘ یہ کن معانی میں استعمال ہو رہا تھا۔ قرآن نے بنیادی اصطلاحات وہیں سے اخذ کی ہیں۔ وہی الفاظ جن کو عرب اپنے اشعار اور خطبات کے اندر استعمال کرتے تھے انہی کو قرآن مجید نے لیا ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے دَور کی زبان کو پہچاننا اور اس کے لیے ضروری مہارت کا ہونا تدبر کے لیے ناگزیر ہے۔ پھر یہ کہ احادیث‘ علمِ بیان‘ منطق‘ ان سب کو انسان بطریقِ تدبر جانے گا تو پھر وہ اس کا حق ادا کر سکے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر کا نام ہی ’’تدبر قرآن‘‘ رکھا ہے اور وہ تدبر قرآن کے بہت بڑے داعی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ ان کے بعض شاگرد حضرات نے بھی محنتیں کی ہیں اور وقت لگایا ہے۔ اس کے ان تقاضوں کو تو اُن حضرات نے بیان کیا ہے‘ لیکن تدبر قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بدقسمتی سے ان کے سامنے بھی نہیں آیا۔ اگر وہ تقاضا بھی پورا نہیں ہوگا تو عصر حاضر کے تدبر کا حق ادا نہیں ہوگا۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ علم انسانی آج جس لیول تک پہنچ گیا ہے‘ میٹیریل سائنسز کے مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں اور وہ خیالات ونظریات جن کو آج دنیا میں مانا جا رہا ہے ان سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اِس دَور کے تدبر قرآن کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو ہر دَور کے اُفق پر خورشیدِ تازہ کی مانند طلوع ہوگی۔ آج سے سو برس پہلے کے قرآن اور آج کے قرآن میں اس حوالے سے فرق ہوگا۔ متن اور الفاظ وہی ہیں‘ لیکن آج علم انسانی کی جو سطح ہے اس پر اس قرآن کے فہم اور اس کے علم کو جس طریقے سے جلوہ گر ہونا چاہیے اگر آپ اس کا حق ادا نہیں کر رہے تو آپ سو برس پہلے کا قرآن پڑھ رہے ہیں‘ آج کا قرآن نہیں پڑھ رہے۔ جیسے اللہ کی شان ہے ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ﴾ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

اسی طرح ہدایتِ عملی کے ضمن میں اقتصادیات‘ سماجیات اور نفسیاتِ انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں‘ انہیں کیسے سمجھیں گے؟ قرآن کی اصل تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کی اصل evaluation کیسے ممکن ہے اگر انسان آج کے اقتصادی مسائل کو نہ جانتا ہو؟ اس کے بغیر وہ تدبر قرآن کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیپر کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟ اقتصادیات کے اصول ومبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ کس طرح کچھ لوگوں نے اس پوری نوعِ انسانی کو معاشی اعتبار سے بے بس کیا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو جب تک نہیں سمجھیں گے تو آج کے دَور میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات واضح کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تدبر قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا‘ اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ میرے کتابچے ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘ کے باب ’’تذکر وتدبر‘‘ میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ ایسی یونیورسٹیز قائم ہوں جن کا اصل مرکزی شعبہ ’’تدبر قرآن‘‘ کا ہو۔ جو شخص بھی اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو‘ وہ عربی زبان سیکھے اور قرآن پڑھے۔ لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علومِ عقلی‘ جیسے منطق‘ مابعد الطبیعیات‘ اخلاقیات‘ نفسیات اور الٰہیات‘ علوم عمرانی جیسے معاشیات‘ سیاسیات اور قانون‘ اور علومِ طبعی‘ جیسے ریاضی‘ کیمیا‘ طبیعیات‘ ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو‘ اور ہر ایک طالب علم ’’تدبر قرآن‘‘ کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔ طالب علم وہ بھی پڑھے تب معلوم ہوگا کہ اس شعبے میں انسان آج کہاں کھڑا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ فلاں شعبے میں نوعِ انسانی کے کیا مسائل ہیں اور اس ضمن میں قرآن حکیم کیا

کہتا ہے۔ مختلف شعبے مل کر تدبر قرآن کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' تذکر کے اعتبار سے قرآن آسان ترین کتاب ہے جو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ ع ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!'' اگر انسان کی فطرت مسخ شدہ نہیں ہے' بلکہ سلیم ہے' صالح ہے' سلامتی پر قائم ہے تو وہ قرآن کو اپنے دل کی پکار محسوس کرے گا' اس کے اور قرآن کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا' وہ اسے اپنے دل کی بات سمجھے گا' اس کے لیے عربی زبان کا صرف اتنا علم کافی ہے کہ براہِ راست ہم کلام ہو جائے۔ جبکہ تدبر کے تقاضے پورے کرنے کسی ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس میدان میں قدم رکھنا چاہے اس کے ذہن میں ایک اجمالی خاکہ ضرور ہونا چاہیے کہ آج جدید سائنسز کے اعتبار سے انسان کہاں کھڑا ہے۔ جب انسان کو اپنے مقام کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ قرآن مجید سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ سمندر میں تو بے تحاشا پانی ہے' آپ اگر پانی لینا چاہتے ہیں تو جتنا بڑا کٹورا' کوئی دیگ' دیگچی یا بالٹی آپ کے پاس ہے اسی کو آپ بھر لیں گے۔ یعنی جتنا آپ کا ظرف ہوگا اتنا ہی آپ سمندر سے پانی اخذ کر سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ ہوگا کہ سمندر میں پانی ہی اتنا ہے! انسانی ذہن کا ظرف علوم سے بنتا ہے۔ یہ ظرف آج سے پہلے بہت تنگ تھا۔ ایک ہزار سال پہلے کا ظرفِ ذہنی بہت محدود تھا۔ انسانی علوم کے اعتبار سے آج کا ظرف بہت وسیع ہے۔ اگر آج آپ کو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو آپ کو اپنا ظرف اس کے مطابق وسیع کرنا ہوگا۔ اور اگر کچھ لوگ ابھی اُسی سابق دور میں رہ رہے ہیں تو قرآن حکیم کے مخفی حقائق اُن پر منکشف نہیں ہوں گے۔

۶) عملی ہدایات اور مظاہر طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل

قرآن حکیم میں سائنسی علوم کے جو حوالہ جات آتے ہیں اور اس میں جو عملی ہدایات ملتی ہیں' ان کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک اعتبار سے ہمیں آگے سے آگے بڑھنا ہے اور دوسرے اعتبار سے ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم پر غور وفکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبارات سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔ سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جایئے۔ آج انسان کو کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں' کون سے حقائق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں' ان کے حوالے پیش نظر رہیں گے۔ اس میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام رازی اور دیگر قدیم مفسرین کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ تأبیر نخل کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے' اس کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) ''اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو''۔ تجرباتی علوم کے مطابق جو تمہیں علم حاصل ہے اس پر عمل کرو۔ لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جایئے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دَور کے تقاضے کچھ اور ہیں' جبکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ ؓ نے کیا کیا۔ اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رُخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سمجھا۔ متأخرین کو چھوڑ کر متقدمین کی طرف جایئے۔ متقدمین سے تبع تابعین' پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ''مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ'' یعنی حضور ﷺ اور صحابہ ؓ کے عمل تک پہنچئے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بأو نرسیدی تمام بولہبی ست!

دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں اگرچہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) ''نماز اِس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ اب نماز کی جزئیات کے بارے میں

روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔ کسی کے نزدیک ایک روایت قابل ترجیح ہے‘ کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل یہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی نوٹ کر لیجیے : ((عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ’’تم پر میری سنت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاءِ راشدین کی سنت جو ہدایت یافتہ ہیں‘‘۔ چنانچہ حضور ﷺ کا عمل اور خلفاء راشدین کا عمل ہمارے لیے لائق تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں اُمت کا اجماع رہا ہے۔ اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (Fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویہ پیدا کر دے‘ مگر ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متاثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ تک پہنچ جائیں!

بدقسمتی سے ہمارے عام علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عربی علوم تو پڑھے ہیں‘ عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں‘ مگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے سائنس نہیں پڑھی‘ وہ جدید علوم سے واقف نہیں‘ وہ نہیں جانتے آئن سٹائن کس بلا کا نام ہے اور اس شخص کے ذریعے طبیعیات کے اندر کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ نیوٹونین ایرا کیا تھا اور آئن سٹائن کا دَور کیا ہے‘ انہیں کیا پتہ! آج کائنات کا تصور کیا ہے‘ ایٹم کی ساخت کیا ہے‘ انہیں کیا معلوم! ایٹم تو پرانی بات ہو گئی‘ اب تو انسان نیوٹرون پروٹون سے بھی کہیں آگے کی باریکیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ان چیزوں کو نہیں جانیں گے تو ان حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہو گا۔ مظاہر طبیعی کا معاملہ تو آگے سے آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے۔ البتہ اس ضمن میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک تو سائنس کے میدان کے محض نظریات (theories) ہیں جنہیں مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہے‘ جبکہ ایک وہ چیزیں ہیں جن کی تجرباتی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں اب مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ہو گا۔ خواہ مخواہ کوئی بھی نظریہ سامنے آ جائے یا کوئی مفروضہ (hypothesis) منظر عام پر آ جائے اس پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن اصولی طور پر ہمیں ان چیزوں کی تعبیر میں آگے سے آگے بڑھنا ہے۔ اور جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں‘ یعنی اوامر و نواہی‘ حلال و حرام‘ حدود و تعزیرات وغیرہ‘ ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہو گا‘ یہاں تک کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دیجیے۔ اس لیے کہ دین اسی کا نام ہے۔

۷) فہم قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت

فہم قرآن کے لیے بنیادی اصول اور بنیادی ہدایات یا اشارات کے ضمن میں مولانا مودودی نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے تفہیم القرآن کے مقدمے میں کہی ہے کہ قرآن محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کسی ڈرائنگ روم میں یا کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ کوئی محقق یا ریسرچ سکالر ڈکشنریوں اور تفسیروں کی مدد سے اسے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

> ’’......اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اُٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں......‘‘

قرآن مجید کی بہت سی بڑی اہم حقیقتیں اس کے بغیر منکشف نہیں ہوں گی' اس لیے کہ قرآن ایک ''کتابِ انقلاب'' (Manual of Revolution) ہے۔ اس قرآن نے انسانی جدوجہد کے ذریعے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی رضی اللہ عنہم ایک حزب اللہ تھے' ایک جماعت اور ایک پارٹی تھے' انہوں نے دعوت اور انقلاب کے تمام مراحل کو طے کیا اور ہر مرحلے پر اس کی مناسبت سے ہدایات نازل ہوئیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی تھا کہ حکم دیا جارہا تھا کہ مار کھاؤ لیکن ہاتھ مت اٹھاؤ۔ ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ حکم دے دیا گیا کہ اب آگے بڑھو اور جواب دو' انہیں قتل کرو۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہوجائے''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور اُن کو قتل کرو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے''۔

دونوں مراحل میں یقیناً فرق ہے' بلکہ بظاہر تضاد ہے' لیکن جاننا چاہیے کہ یہ ایک ہی جدوجہد کے دو مختلف مراحل ہیں۔ پھر ایک داعی جب دعوت دیتا ہے تو جو مسائل اسے درپیش ہوتے ہیں ان کو ایک ایسا شخص قطعاً نہیں جان سکتا جس نے اُس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ اسے کیا احساس ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے یہ کیوں کہا جارہا ہے: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝١ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝٢ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝٣﴾ ''قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں! آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے''۔ یعنی اے نبیؐ آپ محزون اور غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے (معاذ اللہ) مجنون تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ جب کسی کو کہے جاتے ہیں تو اس کا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قریش مکّہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر قلبِ محمدیؐ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ یہ قرآن ہم پر reveal نہیں ہوسکتا جب تک ان احساسات و کیفیات کے ساتھ ہم خود دوچار نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری کیفیات و احساسات اس کے ساتھ مماثلت نہ رکھیں ہم کیسے سمجھیں گے کہ کیا کہا جارہا ہے اور کس کیفیت کے اندر کہا جارہا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبہ سب سے پہلے جس کتاب سے متعارف ہوتے ہیں وہ '' Manual of Dissection'' ہے۔ اس میں ہدایات ہوتی ہیں کہ لاش کے بدن پر یہاں شگاف لگاؤ اور کھال ہٹاؤ تو تمہیں یہ چیز نظر آئے گی' یہاں شگاف لگاؤ تو تمہیں فلاں شے نظر آئے گی' اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو تمہیں اس کے پیچھے فلاں چیز چھپی ہوئی نظر آئے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم '' Manual of Revolution'' ہے۔ جب تک کوئی شخص انقلابی جدوجہد میں شریک نہیں ہوگا قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا خزانہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ ایک شخص فقیہہ ہے' مفتی ہے تو وہ فقہی احکام کو ضرور اس کے اندر سے نکال لے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض تفاسیر ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی گئی ہیں جن میں صرف اُن ہی آیات کے بارے میں گفتگو اور بحث ہے جن سے کوئی نہ کوئی فقہی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً حلت و حرمت کا حکم' کسی شے کے فرض ہونے کا حکم جس سے عمل کا معاملہ متعلق ہے۔ باقی تو گویا قصص ہیں' تاریخی حقائق و واقعات ہیں۔ یہاں تک کہ قصۂ آدم و ابلیس جو سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے' یا ایمانی حقائق کے لیے جو دلائل و براہین ہیں ان سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی' بلکہ صرف احکام القرآن جو قرآن کا ایک حصہ ہے' اسی کو اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن کے تدریجاً نزول کا سبب یہ ہے کہ صاحبِ قرآن ﷺ کی جدوجہد کے مختلف مراحل کو سمجھا جائے' ورنہ فقہی احکام تو مرتب کر کے دیے جا سکتے تھے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیے گئے تھے۔ ''احکامِ عشرہ'' تختیوں پر کندہ تھے جو موسیٰؑ کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدوجہد جس جس مرحلے سے گزرتی رہی قرآن میں اس مرحلے سے متعلق آیات نازل ہوتی رہیں۔ تنزیل کی ترتیب کے اندر مضمر اصل حکمت یہی تو ہے کہ آنحضور ﷺ کی جدوجہد' حرکت اور دعوت کے مختلف مراحل سامنے آجاتے ہیں۔ اب بھی قرآن کی بنیاد پر اور منہج انقلابِ نبویؐ پر جو

جدوجہد ہوگی اسے ان تمام مراحل سے ہوکر گزرنا ہوگا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تو ہو کہ اس جدوجہد کو علمی طور پر فہم کے لیے انسان سامنے رکھے۔ اگر علمی اعتبار سے سیرت النبیؐ کا خاکہ ذہن میں موجود نہ ہو تو فہم کسی درجے میں بھی حاصل نہیں ہوگا۔ فہمِ حقیقی تو اُسی وقت حاصل ہوگا جب آپ خود اس جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہی مسائل آپ کو پیش آ رہے ہیں تو اب معلوم ہوگا کہ یہ مقام اور مرحلہ یا مسئلہ وہ تھا جس کے لیے یہ ہدایتِ قرآنی آئی تھی۔

۸) قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں' خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپ ﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہوا اور حضور ﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا' جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپ ﷺ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت' دیانت' امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرۂ محمدیؐ موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپ ﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا کہ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا هٰذَا بِوَجْهِ كَذَّابٍ (اللہ پاک ہے' یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضور ﷺ کی شخصیت' آپؐ کی ذات اور آپؐ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا' سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿يٰسٓ ۝١ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝٢ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی سیرت و کردار' آپؐ کا اخلاق' آپؐ کا وجود' آپؐ کی شبیہہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی اَن مٹ شہادت ہے۔ آپ ایچ جی ویلز' ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلۂ انقلاب قرآن ہے' یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے' یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تاثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہوگی؟ یہ تو قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ''حضورؐ کی شخصیت''۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپؐ کے کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے ——اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا بتمام و کمال حاصل ہو گیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی ہے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہوگی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے' یقیناً میٹھی ہوگی۔ لیکن ''ہوگی'' سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حسِ ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی

ہے تو اب ''ہوگی'' 'نہیں'' 'ہے''۔ ''ہوگی'' اور ''ہے'' میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے‘ یعنی کسی شے پر آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ اِلّا
لغتِ غریب ‘ جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الٰہ الاّ اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربی النسل ہو‘ عربی زبان جانتا ہو‘ لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے‘ نامانوس سی بات ہے‘ اس کے اندر پیوست نہیں ہے‘ اس کو متاثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے من میں جھانکو‘ دیکھو تو سہی‘ غور تو کرو: اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ؟ کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی؟ کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے‘ وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دَور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم انسیت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود‘ میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔

اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآنؐ کا باہمی تعلق

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ دونوں ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن کے منزّل مِن اللہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی گواہی نبی اکرم ﷺ کی گواہی ہے۔ آپؐ کی شخصیت‘ آپؐ کا کردار‘ آپؐ کا چہرۂ انور اپنی اپنی جگہ پر گواہ ہیں۔ ہمارے لیے اگرچہ آپ ﷺ کی سیرت آج بھی زندہ و پائندہ ہے‘ کتابوں میں درج ہے‘ لیکن ایک مجسم انسانی شخصیت کی صورت میں آپ ﷺ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں‘ ہم آپ ﷺ کے روئے انور کی زیارت سے محروم ہیں۔ تاہم آپ ﷺ کا کارنامہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کی گواہی ہر شخص دے رہا ہے۔ ہر مؤرخ نے تسلیم کیا ہے‘ ہر مفکر نے مانا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب تھا جو حضور ﷺ نے برپا کیا۔ آپؐ کی یہ عظمت آج بھی مبرہن

ہے' آشکارا ہے' اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ قرآن کے منزّل من اللہ اور کلامِ الٰہی ہونے پر سب سے بڑی خارجی گواہی خود نبی اکرم ﷺ ہیں' اور نبی اکرم ﷺ کے نبی اور رسول ہونے کا سب سے بڑا گواہ' سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا ثبوت خود قرآن مجید ہے۔

اس اعتبار سے یہ دونوں جس طرح لازم وملزوم ہیں اس کے لیے میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے استشہاد کر رہا ہوں۔ سورۃ البیّنہ میں فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝﴾

''اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ اُن کے پاس 'بیّنہ' آ جاتی''۔

''بیّنۃ'' کھلی اور روشن دلیل کو کہتے ہیں۔ ایسی بالکل روشن حقیقت جس کو کسی خارجی دلیل کی مزید حاجت نہ ہو وہ ''بیّنہ'' ہے۔ جیسے ہم اپنی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بیّن ہے' بالکل واضح ہے' اس پر کسی قیل وقال کی حاجت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر بیّنہ پر کوئی دلیل لانے کی کوشش کی جائے تو کسی درجے میں شک وشبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے' اس پر یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بیّنہ کیا ہے؟ فرمایا:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝﴾

''ایک رسول اللہ کی جانب سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں''۔

یہاں قرآن حکیم کی سورتوں کو اللہ کی کتابوں سے تعبیر کیا گیا ہے' جو قائم ودائم ہیں اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہیں۔ تو گویا رسولؐ کی شخصیت اور اللہ کا یہ کلام جو اُن پر نازل ہوا' دونوں مل کر ''بیّنہ'' بنتے ہیں۔

میں نے قرآن فہمی کا یہ اصول بارہا عرض کیا ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اس کی نظیر سورۃ الطلاق میں موجود ہے۔ اس کی آیت ۱۰ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝﴾ ''اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے''۔ اور یہ ذکر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط﴾ ''ایک ایسا رسول جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر شے کو روشن کر دینے والی (اور ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے والی) ہیں' تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے''۔ یہاں ''اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ'' کے بجائے ''اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ'' آیا ہے۔ ''بیّن'' وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور ''مُبَیِّن'' وہ چیز ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہے' حقائق کو اجاگر کرتی ہے۔ تو یہاں پر ذکر کی جو تاویل کی گئی کہ ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ اس سے واضح ہوا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے اور گتھے ہوئے ہیں کہ ایک حیاتیاتی وجود (Organic Whole) بن گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے شاید بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔ اس حوالے سے یہ دونوں حقیقتیں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

اگلی بات یہ سمجھیے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظِ دیگر آپؐ کا اصل معجزہ' بلکہ واحد معجزہ قرآن حکیم ہے۔ یہ بات ذرا اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ''معجزہ'' کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام ہو گیا ہے اور ہر خرقِ عادت شے کو معجزہ شمار کیا جاتا ہے۔ معجزہ کے لفظی معنی عاجز کر دینے والی شے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ''عجز'' مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں' لیکن ہمارے ہاں اصطلاح کے طور پر اس لفظ کا جو اطلاق کیا جاتا ہے وہ قرآن حکیم میں مستعمل نہیں ہے' بلکہ اللہ کے رسولوں کو جو معجزات دیے گئے انہیں بھی آیات کہا گیا ہے۔ انبیاء ورُسل اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اللہ کی نشانیاں لے کر آئے۔

اس اعتبار سے معجزہ کا لفظ جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں' اس معنی میں یہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہے۔ البتہ وہ طبیعی قوانین (Physical

(Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے' اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیتِ خصوصی ظاہر ہو تو اسے خرقِ عادت کہتے ہیں۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی ضرب لگائی اور سمندر پھٹ گیا' یہ خرقِ عادت ہے' یعنی جو عادی قانون ہے وہ ٹوٹ گیا۔ ''خرق'' پھٹ جانے کو کہتے ہیں' جیسے سورۃ الکہف میں یہ لفظ آیا ہے ''خَرَقَهَا'' یعنی اس اللہ کے بندے نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے' کشتی کو توڑ دیا۔ پس جب بھی کوئی طبیعی قانون ٹوٹے گا تو وہ خرقِ عادت ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان خرقِ عادت واقعات کے ذریعے سے بہت سے قوانینِ قدرت کو توڑ کر اپنی خصوصی مشیت اور خصوصی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں مسلّم ہے کہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے بھی جن کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا چاہے کرتا ہے' لیکن اصطلاحاً ہم انہیں کرامات کہتے ہیں۔ خرقِ عادت یا کرامات اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون ہے۔

معجزہ بھی خرقِ عادت ہوتا ہے' لیکن رسول کا معجزہ وہ ہوتا ہے جو دعوے کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس میں تحدّی (challenge) بھی موجود ہو۔ یعنی جسے رسول خود اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے اور پھر اُس میں مقابلے کا چیلنج دیا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے ان میں ''یدِ بیضا'' اور ''عصا'' کی حیثیت اصل معجزے کی تھی۔ ویسے آیات اور بھی دی گئی تھیں جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو روشن نشانیاں دیں''۔ مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپؑ ابھی مصر کے اندر تھے۔ پھر جب آپؑ مصر سے باہر نکلے تو عصا کی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اس کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا' اس کی ضرب سے چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ تمام چیزیں خرقِ عادت ہیں' لیکن اصل معجزے دو تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ میری رسالت کا ثبوت ہے۔

جب آپؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور آپ نے اپنی رسالت کی دعوت پیش کی تو دلیلِ رسالت کے طور پر فرمایا کہ میں اس کے لیے سند (سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ) بھی لے کر آیا ہوں۔ فرعون نے کہا کہ لاؤ پیش کرو تو آپؑ نے یہ دو معجزے پیش کیے۔ یہ دو معجزے جو اللہ کی طرف سے آپؑ کو عطا کیے گئے' آپؑ کی رسالت کی سند تھے۔ اس میں تحدّی بھی تھی۔ لہٰذا مقابلہ بھی ہوا اور جادوگروں نے پہچان بھی لیا کہ یہ جادو نہیں ہے' معجزہ ہے۔ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اُسی میدان کے افراد ہی پہچان سکتے ہیں۔ جب جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو عام دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگر ہیں' اس کا جادو زیادہ طاقتور نکلا' اس کے عصا نے بھی سانپ اور اژدھا کی شکل اختیار کی تھی اور ان جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں نے بھی سانپوں کی شکل اختیار کر لی تھی' البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا بڑا سانپ باقی تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجمع ایمان نہیں لایا' لیکن جادوگر تو جانتے تھے کہ اُن کے فن کی رسائی کہاں تک ہے' اس لیے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ جادو نہیں ہے' کچھ اور ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا اصل احساس عرب کے شعراء' خطیبوں اور زبان دانوں کو ہوا تھا۔ عام آدمی نے بھی اگرچہ محسوس کیا کہ یہ خاص کلام ہے' بہت پُرتاثیر اور میٹھا کلام ہے' لیکن اس کا معجزہ ہونا یعنی عاجز کر دینے والا معاملہ تو اسی طرح ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں بار بار چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام پیش کرو۔ اس اعتبار سے جان لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

آپ ﷺ کے خرقِ عادت معجزات تو بے شمار ہیں۔ شقِ قمر قرآن حکیم سے ثابت ہے' لیکن یہ آپ ﷺ نے دعوے کے ساتھ نہیں دکھایا' نہ ہی اِس پر کسی کو چیلنج کیا' بلکہ آپؐ سے جو مطالبے کیے گئے تھے کہ آپؐ یہ یہ کر کے دکھایئے' اُن میں سے کوئی بات اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوئی۔ اللہ چاہتا تو اُن کا مطالبہ پورا کرا دیتا' لیکن اُن مطالبوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ خرقِ عادت واقعات بے شمار ہیں۔ جانوروں کا بھی آپؐ کی بات کو سمجھنا اور آپؐ سے عقیدت کا اظہار کرنا بہت مشہور ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳ اونٹوں کو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے نحر کیا تھا۔ قطار میں سو اونٹ کھڑے کیے

گئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک اونٹ جب گرتا تھا تو اگلا خود آگے آجاتا تھا۔ اسی طرح ''ستونِ حنانہ'' کا معاملہ ہوا۔ حضورﷺ مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے' مگر جب اِس مقصد کے لیے منبر بنا دیا گیا اور آپؐ پہلی مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے تو اُس سوکھے ہوئے تنے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو' اسی لیے تو اسے ''حنّانہ'' کہتے ہیں۔ ایسے ہی کئی مواقع پر تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

اِن خرقِ عادت واقعات کو بعض عقلیت پسند (Rationalists) اور سائنسی مزاج کے حامل لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ پچھلے زمانے میں بھی لوگ ان کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اس پر مولانا روم نے خوب فرمایا ہے کہ: ؎

فلسفی	گو	منکرِ	حنّانہ است
از	حواسِ	انبیا	بیگانہ است!

بہرحال خرقِ عادت واقعات حضورﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہت ہیں۔ (تفصیل دیکھنا ہو تو ''سیرت النبیؐ'' از مولانا شبلی کی ایک ضخیم جلد صرف حضورﷺ کے خرقِ عادت واقعات پر مشتمل ہے) لیکن جیسا کہ اوپر گزرا' معجزہ دعوے کے ساتھ اور رسالت کے ثبوت کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال حضرت عیسٰیؑ کی آئی ہے کہ آپؑ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میں مُردوں کو زندہ کر کے دکھا رہا ہوں۔ میں گارے سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اُس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ خرقِ عادت کا معاملہ تو غیر نبی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے بھی اس طرح کے حالات پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے اظہار کے لیے کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہ چیزیں بعید نہیں ہیں' لیکن انبیاء کی کرامات کو عرفِ عام میں ''معجزات'' کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء اور اولیاء کے لیے ''کرامات'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معجزہ وہ ہے جسے اللہ کا رسول دعوے کے ساتھ پیش کرے اور چیلنج کرے۔

یہ بات کہ قرآن مجید ہی حضورﷺ کا اصل معجزہ ہے' دو اعتبارات سے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ ایک مثبت انداز ہے' جیسے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات میں فرمایا: ﴿یٰسٓ ﴿۱﴾ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ ﴿۲﴾ اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۳﴾﴾ ''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی (اور قسم کا اصل فائدہ شہادت ہوتا ہے' یعنی گواہ ہے یہ قرآن حکیم) کہ یقیناً (اے محمدﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ خطاب بظاہر حضورﷺ سے ہے' حالانکہ حضورؐ کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے' بلکہ مخاطبین یعنی اہل عرب اور اہل مکّہ کو سنایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن شاہد ہے' یہ ثبوت ہے' یہ دلیلِ قطعی ہے کہ محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں' یہ قرآن پکار پکار کر محمد رسول اللہﷺ کی رسالت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چار مقامات اور ہیں جن میں یہی آیت ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ﴾ مقدر ہے' اگرچہ بیان نہیں ہوئی۔ سورۂ صٓ کا آغاز ہوتا ہے: ﴿صٓ وَالۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ﴿۱﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ ﴿۲﴾﴾ ''صٓ' قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت (یاددہانی) والا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو منکر ہیں' گھمنڈ اور ضد میں پڑے ہوئے ہیں''۔ یہاں ''صٓ'' ایک حرف ہے' لیکن اس سے آیت نہیں بنی' جبکہ ''یٰسٓ'' ایک آیت ہے۔ سورۂ صٓ کی پہلی آیت قسم پر مشتمل ہے۔ ''بَلْ'' سے جو دوسری آیت شروع ہو رہی ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ مُقسَم علیہ (جس چیز پر قسم کھائی جا رہی ہے) یہاں محذوف ہے اور وہ (اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ) ہے۔ گویا کہ معناً اسے یوں پڑھا جائے گا: ﴿صٓ وَالۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ ﴿۱﴾ (اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ) بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا......﴾۔ اسی طرح سورۂ قٓ میں ہے: ﴿قٓ ۚ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡمَجِیۡدِ ﴿۱﴾ (اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ) بَلۡ عَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ......﴾۔

ایسے ہی دوسورتیں الزخرف اورالدخان ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ان کی پہلی دوآیات بالکل ایک جیسی ہیں:﴿حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢﴾۔ پہلی آیت حروفِ مقطعات پراوردوسری آیت قَسم پر مشتمل ہے۔اس کے بعد مُقسَم علیہ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) محذوف ماننا پڑے گا۔گویا:﴿حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣﴾ اور:﴿حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝٣﴾۔ یہ ایک اسلوب ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی قسم کھائی گئی' یعنی قرآن کی گواہی اور شہادت پیش کی گئی۔ یہ اِس بات کو کہنے کا ایک اسلوب ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا آپؐ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

پہلے گزر چکا ہے کہ معجزے میں تحدّی (چیلنج) بھی ضروری ہے اور دعویٰ بھی۔لہٰذا وہ مقامات گن لیجیے جن میں چیلنج ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے' انسانی کلام ہے' محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے' یہ اُن کی اپنی اختراع ہے تو تم مقابلہ کرو اور ایسا ہی کلام پیش کرو۔قرآن مجید میں ایسے پانچ مقامات ہیں۔سورۃ الطّور میں فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝٣٣ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝٣٤﴾

''کیا اُن کا یہ کہنا ہے کہ یہ محمدؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں''۔

قَالَ' يَقُوْلُ کا معنی ہے کہنا۔جبکہ تَقَوَّلَ' يَتَقَوَّلُ کا مفہوم ہے تکلف کر کے کہنا' یعنی محنت کر کے کلام موزوں کرنا (جس کے لیے انگریزی میں composition کا لفظ ہے۔) تو کیا اُن کا خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ نے خود کہہ لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں' لہٰذا اس طرح کی کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔اگر یہ سچے ہیں تو ایسا ہی کلام پیش کریں۔آخر یہ بھی انسان ہیں' اِن میں بڑے بڑے شعراء اور بڑے قادر الکلام خطیب موجود ہیں۔ان میں وہ شعراء بھی ہیں جن کو دوسرے شعراء سجدہ کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مل کر ایسا کلام پیش کریں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝٨٨﴾

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام جن و اِنس جمع ہو جائیں (اور اپنی پوری قوت و صلاحیت اور اپنی تمام ذہانت و فطانت' قادر الکلامی کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اِس قرآن جیسی کتاب پیش کر دیں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لاسکیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں''۔

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔سورۂ یونس میں اس سے ذرا نیچے اتر کر' جسے بر سبیل تنزّل کہا جاتا ہے' فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝١٣﴾ (ھود)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورۃ کا چیلنج بھی دیا گیا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۳۸)﴾ (یونس)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

یہ چاروں مقامات تو مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ ''البقرۃ'' ہے۔ اس میں بڑے اہتمام کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۳)

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (۲۴)﴾

''اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورۃ تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (ان سب کو جمع کر لو) اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے' تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے' یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے''۔

یہ اصل میں وہی انداز ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ واضح یہ کیا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تم سچے نہیں ہو' تمہارا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' لیکن چونکہ تم زبان سے تنقید کر رہے ہو اور جھٹلا رہے ہو تو اگر واقعتاً تمہیں شک ہے تو اِس شک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دو اسلوب۔ ایک مثبت انداز ہے کہ قرآن گواہ ہے اس پر کہ اے محمد ﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں' اور دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

اب اس ضمن میں تیسری ذیلی بحث یہ ہو گی کہ قرآن مجید کس کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہ مضمون اتنا وسیع اور اتنا متنوّع الاطراف ہے کہ ''وجوہِ اعجاز القرآن'' پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر بات ہے اس وقت اِس کا احاطہ مقصود نہیں ہے' صرف موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

اصل شے تو اِس کی تاثیر قلب ہے کہ یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔ اس کا اصل اعجاز یہی ہے کہ یہ دل کو جا کر لگتی ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے اندر تعصب' ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ براہِ راست قرآن اس کے دل پر اتر سکے۔ یہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو ہے۔ لیکن اضافی طور پر جان لیجیے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت کے اعتبار سے اس کے معجزہ ہونے کا نمایاں اور اہم تر پہلو اِس کی ادبیت' اِس کی فصاحت و بلاغت' اس میں الفاظ کا انتخاب' بندشیں اور ترکیبیں' اس کی مٹھاس اور اس کا صوتی آہنگ ہے۔ یہ درحقیقت نزول کے وقت قرآن کے معجزہ ہونے کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہر رسول کو اُسی طرز کا معجزہ دیا گیا جن چیزوں کا اُس کے زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اور شغف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو عام تھا لہٰذا مقابلے کے لیے آپؑ کو وہ چیزیں دی گئیں جن سے آپؑ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ حضور ﷺ نے جس قوم میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اُس قوم کا اصل ذوق قدرتِ کلام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اصل میں بولنے والے تو ہم ہی ہیں' باقی دنیا تو گونگی ہے۔ ان کی زبان دانی کا یہ عالَم تھا کہ وہ اپنی پسند کی اشیاء کے نام رکھنا شروع کرتے تو ہزاروں نام رکھ دیتے۔ چنانچہ عربی میں شعر اور تلوار کے لیے پانچ پانچ ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے

اور اونٹ کے لیے لاتعداد الفاظ ہیں۔ یہ اُن کی قادرالکلامی ہے کہ کسی شے کو اُس کی ہر ادا کے اعتبار سے نیا نام دے دیتے۔ گھوڑا اُن کی بڑی محبوب شے ہے' لہٰذا اُس کے نامعلوم کتنے نام ہیں۔ شعر وشاعری میں ان کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ہاں سالانہ مقابلے ہوتے تھے تاکہ اس سال کے سب سے بڑے شاعر کا تعین کیا جائے۔ شعراء اپنے اپنے قصیدے لکھ کر لاتے تھے' مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوتا تھا کہ کس کا قصیدہ سب پر بازی لے گیا ہے تو باقی تمام شعراء اس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اُس کو سجدہ کرتے تھے۔ پھر وہ قصیدہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ یہ ہے اس سال کا قصیدہ۔ چنانچہ اس طرح کے سات قصیدے خانہ کعبہ میں آویزاں تھے جنہیں ''سَبْعَة مُعَلَّقَة'' کہا جاتا تھا۔ سبعة معلقة کے آخری شاعر حضرت لبید ﷛ تھے جو ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔ حضرت عمر ﷛ نے اُن سے کہا کہ اے لبید! اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو جواب میں انہوں نے بڑا پیارا جملہ کہا کہ ''اَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟'' یعنی کیا قرآن کے نزول کے بعد بھی؟ اب کسی کے لیے کچھ کہنے کا موقع باقی ہے؟ قرآن کے آجانے کے بعد کوئی اپنی فصاحت وبلاغت کے اظہار کی کوشش کر سکتا ہے؟ گویا زبانیں بند ہو گئیں' اُن پر تالے پڑ گئے' ملک الشعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔

جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے وہ آج بھی قرآن کے اِس اعجاز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غیر عرب لوگوں کے لیے اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنی محنت سے عربی ادب کے اندر مولانا علی میاں کی سی مہارت حاصل کر لے تو وہ واقعتاً اس کو محسوس کر سکے گا اور اس کی تحسین کر سکے گا کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا کیا مقام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے' البتہ اس کا صوتی آہنگ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت کے اندر ایک معجزانہ تأثیر ہے جو قلب کے اندر عجیب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کا صوتی آہنگ ہماری فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ تأثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرورِ ایام سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت' اس کی ادبیت' عذوبت اور اس کے صوتی آہنگ کی معجزانہ تأثیر پر مستزاد عہد حاضر میں قرآن کے اعجاز کے ضمن میں جو چیزیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ط﴾ (حٰمٓ السجدة:۵۳)

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور اُن کی اپنی جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات اُن پر واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔''

اِس آیت مبارکہ میں علمِ انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات وانکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیاتِ آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بکائی کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ میرا دل اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اُس دَور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا' علومِ انسانی اور معلوماتِ انسانی کا دائرہ محدود تھا' اس وقت سائنسی اشارات کی حامل آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا' وہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا ہے! تورات سے مراد Old Testament ہے۔ اناجیل اربعہ جو حضرت عیسیٰ ؑ کی طرف منسوب ہیں' اُن میں تو کئی چیزیں ایسی ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اناجیل میں زیادہ تر اخلاقی مواعظ ہیں یا پھر حضرت عیسیٰ ؑ کے سوانح حیات ہیں۔ تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی' اللہ نے کیسے اسے بنایا۔ مختلف سائنسی phenomena اس میں موجود ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ فزکس میں آج سب سے زیادہ اہم موضوع جس پر تحقیق ہو رہی ہے' یہی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی' ابتدائی حالات کیا

تھے اور بعد ازاں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر موریس بکائی نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں تو ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل تورات تو ساتویں صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی۔ بخت نصر کے حملے میں یروشلم کو تہس نہس کر دیا گیا اور ہیکلِ سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی' اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں اور یروشلم کے بسنے والے چھ لاکھ کی تعداد میں قتل کر دیے گئے جبکہ بخت نصر چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ہمراہ بابل لے گیا۔ چنانچہ یروشلم میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا۔ آپ اندازہ کریں' اگر یہ اعداد وشمار صحیح ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی سات سو سال قبل یعنی آج سے ۲۶۰۰ برس قبل یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا اور اس شہر پر کیا قیامت گزری ہوگی! اس کے بعد سے وہ اصل تورات دنیا میں نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو جو احکامِ عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے تھے وہ پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں بھی لاپتہ ہو گئیں اور باقی تورات کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ قرآن حکیم میں ''صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى '' کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے پانچ ہیں جو عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابیں ہیں۔ سانحۂ یروشلم کے قریباً ڈیڑھ سو برس بعد لوگوں نے تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا۔ چنانچہ اُس وقت کی نوعِ انسانی کی ذہنی اور علمی سطح جو تھی وہ اِس پر لازمی طور پر اثر انداز ہوئی۔

ڈاکٹر موریس بکائی کے علاوہ میں ڈاکٹر کیتھ این مور کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ وہ قرآن حکیم میں علمِ جنین سے متعلق اشارات پا کر کس قدر حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آ گئیں! فزیکل سائنسز کے مختلف فیلڈ ہیں' ان میں جیسے جیسے علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلام حق ہے اور یہ کلام مظاہرِ طبیعی کے اعتبار سے بھی حق ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

عہد حاضر کے اعتبار سے قرآن حکیم کے اعجاز کا دوسرا اہم تر پہلو اِس کی ہدایتِ عملی ہے۔ اس میں انفرادی زندگی سے متعلق بھی مکمل ہدایات ہیں اور انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے رویّہ کے بارے میں بھی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ انفرادی زندگی سے متعلق یہ تمام چیزیں سابقہ انبیاء کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاقی اقدار ویسے بھی فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کا اپنا کہنا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشّمس) یعنی نفسِ انسانی کو الہامی طور پر یہ معلوم ہے کہ فجور کیا ہے اور تقویٰ کیا ہے۔ پرہیزگاری کسے کہتے ہیں اور بدکاری کسے کہتے ہیں۔ البتہ قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں عدل و قسط پر مبنی اجتماعی نظام دیا گیا ہے جس میں انتہائی توازن رکھا گیا ہے۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ نوعِ انسانی کو تین بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدم توازن سے انسانی تمدن فساد اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان میں پہلا عقدۂ لاینحل یہ ہے کہ مَرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں کیا توازن ہے؟ دوسرا یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین کیا توازن ہے؟ پھر تیسرا یہ کہ فرد اور ریاست یا فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کے اعتبار سے کیا توازن ہے؟ اِن تینوں معاملات میں توازن قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر فرد کو ذرا زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے تو انارکی (chaos) پھیلتی ہے۔ آزادی کے نام پر دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے! دوسری طرف اگر فرد کی آزادی پر قدغنیں اور بندشیں لگا دی جائیں تو وہ ردّعمل ہوتا ہے جو کمیونزم کے خلاف ہوا۔ فطرتِ انسانی اور طبیعتِ انسانی نے یہ قدغنیں قبول نہیں کیں اور اِن کے خلاف بغاوت کی۔

عورت اور مرد کے حقوق کے مابین توازن کا معاملہ بھی انتہائی حساس ہے۔ اس میزان کا پلڑا اگر ذرا سا مَرد کی جانب جھکا دیا جائے تو عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' وہ بالکل بھیڑ بکری کی طرح مرد کی مِلک بن کر رہ جاتی ہے' اس کا کوئی تشخص نہیں رہتا اور وہ مرد کی جوتی کی نوک قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا پلڑا ذرا جھکا دیا جائے تو عورت کو جو حیثیت مل جاتی ہے وہ قوموں کی قسمتوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس سے خاندانی ادارہ ختم

ہو جاتا ہے اور گھر کے اندر کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال سکینڈے نیوین ممالک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے ارضی پر اگر جنت دیکھنی ہو تو اِن ممالک کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضروریات کس خوبصورتی کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں! وہاں علاج اور تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہیں اور اس ضمن میں خیرات (charity) پر پلنے والوں اور ٹیکس ادا کرنے والوں کے مابین کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ لیکن ان ممالک میں مرد اور عورت کے حقوق کے مابین توازن برقرار نہیں رکھا گیا جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ مضمحل ہوا' بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا اور گھر کا سکون ناپید ہو گیا۔ چنانچہ آج خودکشی کی سب سے زیادہ شرح سویڈن میں ہے۔ اس لیے کہ گھر کا سکون ختم ہو جانے کے باعث اعصاب پر شدید تناؤ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ برقرار ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نام نہاد طور پر بہت اونچی سطح کے لوگوں کے ہاں تو وہ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں' تاہم مجموعی طور پر ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ ابھی کافی حد تک محفوظ ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں لفظ ''سکون'' استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ ملاحظہ ہو:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ط﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے' تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

اگر انسان کو یہ سکون نہیں ملتا تو اگرچہ اس کی کھانے پینے کی ضروریات' جنسی تسکین اور دوسری ضروریاتِ زندگی خوب پوری ہو رہی ہوں لیکن زندگی انسان کے لیے جہنم بن جائے گی۔

مذکورہ بالا تین عقدہ ہائے لاینحل میں سے معاشیات کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیں گے تو صورت حال ایک انتہا کو پہنچ جائے گی اور مزدور کا بدترین استحصال ہوگا' جبکہ مزدور کو زیادہ حقوق دے دیں گے تو سرمائے کو کوئی تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اگر نیشنلائزیشن ہو جائے تو لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کے بعد کیا ہوا! روس کی اقتصادی موت کی اہم وجہ یہی نیشنلائزیشن تھی۔ تو اب سرمائے اور محنت میں توازن کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ یہ ہے درحقیقت عہد حاضر میں قرآن کی ہدایت کا اہم ترین حصہ! آج اس پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ فزیکل سائنسز سے قرآن کی حقانیت کے ثبوت خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں اور اِن سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن حق ہے۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم نے عمرانیاتِ انسانیہ اور اجتماعیات مثلاً اقتصادیات' سیاسیات اور سماجیات کے ضمن میں جو عدلِ اجتماعی دیا ہے اس کو مبرہن کیا جائے۔ علامہ اقبال کے یہ دو شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است!

یعنی دنیا میں جو سوشل انقلاب آیا ہے اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ ہی سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان چار و ناچار

حضورﷺ کے لائے ہوئے نظام ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط وتفریط کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوا چاروناچار اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں محمد رسول اللہﷺ اور قرآن حکیم نے اسے پہنچایا تھا۔

عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال

وجوہِ اعجازِ قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان ومکان کے ایک خاص تناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا۔ اس کے اوّلین مخاطب عرب کے اجڈ' دیہاتی' بدو اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے ''قَوْمًا لُّـدًّا'' قرار دیا ہے۔ لیکن اِس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑا دی۔ اُن کے ذہن' قلب اور روح کو متأثر کیا' پھر اُن میں جذبہ پیدا کیا' ان کے باطن کو منور کیا۔ ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے ایسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدن' نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دَور کا آغاز کیا ــــــ لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا' جس نے مشرق ومغرب کے فلسفے پڑھ لیے' جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا' جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا' اُس کو اِس قرآن نے اس طرح possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تشنگیٔ علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود اُن کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی ' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں!

میرا ایک کتابچہ ''علامہ اقبال اور ہم'' ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میری ایک تقریر ہے جو میں نے ایچی سن کالج میں ۱۹۷۳ء میں کی تھی۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمتِ قرآن کا نشان' (۲) واقفِ مرتبہ ومقامِ قرآن' اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم ومعارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دَور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار لی ہیں اور پھر اُن کو بڑے پیانے پر پھیلایا ہے۔ ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابل قدر ہے' لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے نام ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگراں سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے اُن کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطل ہو گیا۔ تاہم فرصت کے اُن ایّام میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تأثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تأثر تو یہ تھا کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!'' مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تأثر یہ تھا کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اِس اُمت میں پیدا ہوا' لیکن یہ اُمت ٹس سے مس نہ ہوئی تو ہماشما کے کرنے سے کیا ہو گا!'' جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لا سکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال پر ہوا ہے میری معلومات کی حد تک (اگرچہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا احساس کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دید اور اُن کا تجربہ ہے' کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ تکلف اور آورد سے ماورا انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں: ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا است ایں
چو بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

''وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ' جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّوبدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(یہ کتابِ حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے''۔

قرآن حکیم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں: ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست

عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

''اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں''۔ (گویا ہر زمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان اور نئی آن بان کے ساتھ دنیا میں آیا ہے۔)

اب آپ علامہ اقبال کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے مناجات کرتے ہوئے کہے۔ اِن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہیں کتنا یقین تھا کہ میرے فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ ''مثنوی اسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ '' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ: ؎

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است

ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن

ایں خیاباں را زخارم پاک کن!

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!

بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو' اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے' تو (اے نبی ﷺ!) آپ میرے ناموسِ فکر کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں!''

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے۔اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں مَیں نے جو بات ۱۹۷۳ء میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ ''اس دَور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو''۔اور یہ کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی الی القرآن اقبال ہے۔علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دُوری پر مرثیہ کہتے ہیں: ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں

ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسیــــــــــــــــــــــــــــــنِ او آساں بمیری!

''اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالمِ نزع میں اِس کی سورۂ یٰـــسٓ سنا دو' تا کہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔''

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے' تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مرثیے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے:۔

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراقیؔ در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش
واعظِ دستاں زنِ افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو!

''ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقیؔ کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں' لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے' اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!''

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور اُمت مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا اصل سبب قرآن سے دُوری اور کتابِ الٰہی سے بُعد ہی ہے۔ چنانچہ ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ درد انگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بےتعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔''

میں اپنا یہ تأثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصرِ حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجے اُن پر منکشف تھی' میں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دورِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

قرآن ''حبل ُاللہ'' ہے!

جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ''حبلُ اللہ'' ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ''حَبل'' کے ایک معنی رسّی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللّھب میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ﴿۵﴾﴾ یعنی مونج کی بٹی ہوئی رسّی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ''استعیر للوصل ولکل ما یتوسل به الی شیء'' یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہد' قول وقرار اور میثاق دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے' اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو' حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط﴾

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی' سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔''

گویا خود اپنے بل پر' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر' خود مختاری کے بل پر اُن کے لیے عزت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹا لے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہل ایمان سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آل عمران: ۱۰۳) ''اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر''۔ البتہ ''حبلُ اللہ'' کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو' مجمل ہو' اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴) ''اور ہم نے (اے نبیؐ) آپ کی طرف 'الذکر' نازل کیا' تاکہ جو چیز اُن کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے واضح کریں''۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ''حبلُ اللہ'' قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ ، اَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ......))

''آ گاہ رہو! میں تمہارے مابین دوخزانے چھوڑے جارہا ہوں' اُن میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے' وہی حبلُ اللہ ہے......''

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں الفاظ آئے ہیں:((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں:((ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَتِیْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسی ہے''۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:((اِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللّٰہِ وَالنُّوْرُ الْمُبِیْنُ)) ''یقیناً یہ قرآن حبلُ اللہ اور نورِ مبین ہے''۔

قرآن کو ''رسّی'' کس اعتبار سے کہا گیا ہے' اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ''تعلق مع اللہ'' اور ''تقرب الی اللہ'' دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لٹک جانا۔ ''علق'' لٹکی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ''تعلق مع اللہ'' کا مفہوم ہوگا اللہ سے لٹک جانا' یعنی اللہ سے چمٹ جانا' اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ''تقرب الی اللہ'' کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں:((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے' اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو' اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے' اللہ کا قرب حاصل کرلو گے۔

دوسری معجم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔ اس میں اِن الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپؐ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کا مذاکرہ کررہے تھے' قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((اَلَسْتُمْ تَشْھَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ؟)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا: بَلٰی یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم' ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ وَطَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اِن احادیث مبارکہ سے ''حبلُ اللہ'' کا یہ تصور واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔

ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ''جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ'' کے الفاظ آئے ہیں' کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داؤد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے:((اِنَّکُمْ لَا تَرْجِعُوْنَ اِلَی اللّٰہِ بِشَیْءٍ اَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْہُ یَعْنِی الْقُرْآنَ)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کرسکتے جو خود اُسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے' یعنی قرآن مجید۔ درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے' تو اس سے

بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تبع تابعین کے دَور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنا لیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دَور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپؒ گھر پر گزارتے اور اِس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے' باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں' تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟'' لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو۔

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے اِن گلوں میں' پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد' ترمذی' ابوداوٗد' نسائی' ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے:

((يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا))

''(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا' اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے''۔

لیکن واضح رہے کہ صاحب قرآن سے مراد صرف حافظ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں' بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہیں' اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں معین ہوگا جہاں ان کا سرمایۂ قرآن ختم ہوگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغبؒ کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ''حبل'' کا لفظ وصل کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہوگا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں حبل اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آ کر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے' لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آ کر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذاتِ باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری روح بھی اللہ ہی کے امرِ کُن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین' اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (''حقیقت ایمان'' کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آ چکا ہے)۔

ایک ایمان تو تقلیدی ہے' یعنی غیر شعوری ایمان' کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' چاہے وہ علیٰ وجہ البصیرت نہ ہو' اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے' لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف:۱۰۸) ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ

بھی)''۔علیٰ وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان' اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

عاقل یعنی غور وفکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع وسرچشمہ صرف قرآنِ حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے''حبل اللہ'' ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہل ایمان کو جوڑنے والی رسّی' ان کو باہم ایک دوسرے سے باندھ دینے والی شے' ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔فرمایا:﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!''اہل ایمان کو جوڑنے والی اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسی یہی قرآن حکیم ہے۔اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہوگا جو فکر ونظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آجاتے ہیں۔جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کرلیا' کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کرلیا۔یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔انسان حیوانِ عاقل ہے۔یہ سوچتا ہے' غور کرتا ہے' اس کے نظریات ہیں' اس کے کچھ اہداف ومقاصد ہیں' کوئی نصب العین ہے۔نظریات' مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہوگا۔اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھامو گے تو گویا دو رشتے قائم ہو گئے۔ایک رشتہ اہل ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہل ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ —— جیسے کُل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔اسی طرح حبل اللہ ایک طرف اہل ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہل ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور''کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ'' بنا دینے والی شے ہے۔یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے:

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبل اللہ اوست!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔لہٰذا اے مسلمان! تو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ 'حبل اللہ' یہی ہے''۔

حبل اللہ کے بارے میں مفسرین کے ہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد قرآن ہے' کلمہ طیبہ ہے' اسلام ہے۔یہ ساری چیزیں اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن احادیث نبویؐ کی روشنی میں اس کا مصداقِ کامل قرآن ہی ہے۔اور پھر اس کی جس قدر عمدہ تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے' یہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے بھی میرے نزدیک بہت عمدہ مقام ہے:

ما ہمہ خاک و دلِ آ گاہ اوست
اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ کے الفاظ کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم باہم دشمن تھے' پھر اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے''۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو اہل ایمان کے دلوں کو جوڑتا اور ان کو باہم پیوست کرتا ہے' اور یہ دلی تعلق اور دلی ہم آہنگی ہی ہے جو مسلمانوں کو بنیانِ مرصوص بنانے والی شے ہے۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تعارفِ قرآن کے ضمن میں جو کچھ میں نے عرض کیا ان سب باتوں کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے وہ کیا ہے؟ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں مجھ پر اور آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس کے اعتبار سے میں خاص طور پر اپنی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے لیے دو بنیادوں میں سے ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔ ابتدائی چھ سات سال تو میں تنہا تھا۔ نہ کوئی انجمن تھی' نہ کوئی ادارہ' نہ جماعت۔ پھر انجمن خدام القرآن قائم ہوئی' پھر ۱۹۷۷ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر اسی کے بطن سے قرآن کالج کی ولادت ہوئی' جس کے سر پر قرآن آڈیٹوریم کا تاج سجا ہوا ہے۔ اس پوری جدوجہد کی بنیاد اور اساس دو کتابچے ہیں: (۱) ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کرنے کا اصل کام''۔ یہ مضمون میں نے ۱۹۶۷ء میں میثاق کے اداریے کے طور پر لکھا تھا۔ (۲) ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق''۔ یہ کتابچہ میری دو تقریروں پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۶۸ء میں کی تھیں۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں جشن خیبر اور جشن مہران وغیرہ جیسے مختلف عنوانات سے جشن منائے جا رہے تھے' جن میں راگ رنگ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ صدر ایوب خان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شکست وریخت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے' لیکن ''سب اچھا ہے'' کے اظہار کے لیے یہ شاندار تقریبات منعقد کی جا رہی تھیں۔ یہ گویا اُن کے دورِ حکومت کی آخری بھڑک تھی' جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: ع ''مست رکھو ذکر وفکرِ صبح گاہی میں اسے!'' لیکن اُن دنوں ذکر وفکر کی بجائے لوگوں کو راگ رنگ کی محفلوں میں مست رکھنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مذہبی لوگوں کو رشوت کے طور پر ''جشنِ نزولِ قرآن'' عطا کیا گیا کہ تم بھی جشن مناؤ اور اپنا ذوق وشوق پورا کرلو۔ چنانچہ چودہ سوسالہ ''جشنِ نزولِ قرآن'' کا انعقاد ہوا۔ اس کے ضمن میں قراءت کی بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوئیں' جن میں پوری دنیا سے قرّاء حضرات شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں سونے کے تار سے قرآن لکھنے کا پروجیکٹ شروع ہوا۔

اُس وقت میرا ذہن منتقل ہوا کہ کیا قرآن حکیم کا ہم پر یہی حق ہے؟ کیا اپنے ان کاموں سے ہم قرآن مجید کا حق ادا کر رہے ہیں؟ چنانچہ میں نے مسجد خضراء سمن آباد میں اپنے دو خطاباتِ جمعہ میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق بیان کیے کہ ہر مسلمان پر حسب استعداد قرآن مجید کے پانچ حق عائد ہوتے ہیں:

۱) اسے ماننے جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان وتعظیم)
۲) اسے پڑھے جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت وترتیل)

۳) اسے سمجھے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔(تذکر و تدبر)

۴) اس پر عمل کرے جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔(حکم و اقامت)

انفرادی زندگی میں حکم بالقرآن یہ ہے کہ ہماری ہر رائے اور ہر فیصلہ قرآن پر مبنی ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں قرآن پر عمل کی صورت اقامت ما انزل من اللہ یعنی قرآن کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ط﴾ (المائدة:٦٨)

''اے کتاب والو! تمہارا کوئی مقام نہیں جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے تمہارے ربّ کی طرف سے''۔

۵) قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا اور عام کرنا۔ (تبلیغ و تبیین)

ان پانچ عنوانات کے تحت الحمدللہ ثم الحمدللہ یہ بہت جامع کتابچہ مرتب ہوا اور بلا مبالغہ یہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے۔ پھر انگریزی' عربی' فارسی اور سندھی میں اس کے تراجم ہوئے۔ جو حضرات بھی ہماری اس تحریک رجوع الی القرآن سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں' میرے دروس میں شریک ہوتے ہیں یا ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں میرا ناصحانہ مشورہ ہے کہ اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ درحقیقت ''تعارفِ قرآن'' پر میرے خطابات کا لازمی نتیجہ اور ان کا ضروری تکملہ ہے۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اگر ہم یہ حقوق ادا نہیں کرتے تو ازروئے قرآن ہماری حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ سورۃ الفرقان میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾﴾

''اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے ذیل میں حاشیہ میں لکھا ہے:

''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیح قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں''۔

بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں' اگر انہیں ہم ادا نہیں کر رہے تو حضور ﷺ کے اس قول اور فریاد کا اطلاق ہم پر بھی ہوگا۔ گویا کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے خلاف مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔

علامہ اقبال اسی آیت قرآنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!''

قرآن مجید میں دو مقامات پر قرآن کے حقوق ادا نہ کرنے کو قرآن کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ سمجھیں کہ آپ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن اگر آپ اس کے حقوق کی ادائیگی اپنی استعداد کے مطابق، اپنی امکانی حد تک نہیں کر رہے تو درحقیقت قرآن کو جھٹلا رہے ہیں۔ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی یہود کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵﴾

''مثال ان لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے، پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ بُری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ہمیں کانپنا چاہیے، لرزنا چاہیے کہ کہیں ہمارا شمار بھی انہی لوگوں میں نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ الواقعہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿فَلَا اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝۷۵ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝۷۶ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝۷۷ فِىْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝۷۸ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝۷۹ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۸۰ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝۸۱ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝۸۲﴾

''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی، اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے، کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے، ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو، اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

اس قرآن، اس عظمت والی کتاب، جو کتاب کریم ہے، کتاب مکنون ہے، کے بارے میں تمہاری یہ سستی، تمہاری یہ کسل مندی، تمہاری یہ ناقدری اور تمہارا یہ عملی تعطل کہ تم اسے جھٹلا رہے ہو! تم نے اپنا حصہ اور نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ تکذیب اس معنی میں بھی کہ قرآن کا انکار کیا جائے، اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے — اور تکذیب عملی کے ضمن میں وہ چیز بھی اس کے تابع اور شامل ہو گی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی حاملِ کتابِ الٰہی ہونے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے کہ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ان حقوق کے ادا کرنے کی اپنی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo